خلافت کو کیسے تباہ کیا گیا

عبد القدیم زَلوم

پہلا ایڈیشن: 1382ھ–1962ء
تیسرا ایڈیشن: 1410ھ–1990ء
عربی سے اردو ترجمہ: 1442ھ-2021ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمنِ الرَّحِيم

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّه بأفْواهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلاَّ أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الكافِرُونَ ۞ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالهُدَى وَدِينِ الحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ المُشْرِكُونَ ۞

یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھادیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں اگرچہ کافروں کو برُا ہی لگے۔ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تا کہ اس (دین) کو (دنیا کے) تمام ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

(**التوبہ**:32-33)

فہرست

اسلام اور کفر کے مابین کشمکش 6

یورپی ممالک کی اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں 9

قومیت کے نعرے بھڑکانا اور علیحدگی کے جذبے کو اکسانا 17

مسیحی تبلیغی اور ثقافتی حملے 30

مغربی آئین کے قوانین متعارف کرنے کی کوشش 35

مغربی قوانین کو اختیار کرنا 44

ثقافتی اور قانون سازی کی یلغار کا اثر 73

دولتِ خلافت کو ٹکرے ٹکرے کرنے کی کوشش 74

حلیفوں کی جمال پاشا کو اُکسانے کی کوشش 76

مصطفی کمال کا ریاست کو جنگ سے پیچھے ہٹانے اور انگریزوں کی ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے کیلئے کام کرنا 83

دولت عثمانیہ کا شکست کھانا 95

خلافت کو سیاسی اور قانونی اقدامات کے ذریعہ ختم کرنے کی برطانوی کوشش 104

برطانیہ کی جانب سے مصطفی کمال کی بغاوت کی پشت پناہی 121

مصطفیٰ کمال کی بغاوت کا پہلا دور 124

مصطفیٰ کمال کا انقرہ کو مرکز بنانا 139

دوسرے دور میں مصطفیٰ کمال کی بغاوت کی طرف واپسی 142

مہلک حملہ 145

اہم مسائل اور زندگی و موت کا اقدام 153

اسلام کی نظر میں اہم ترین مسائل 157

اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کے مطابق حکومت کا قیام یعنی خلافت مسلمانوں کا اہم ترین مسئلہ ہے 168

اسلام اور کفر کے مابین کشمکش

جب سے اسلام کا ظہور ہوا، تب سے اسلامی افکار اور کفریہ افکار کے درمیان اور مسلمان اور کفار کے مابین جاری کشمکش زبردست اور شدید رہی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو بھیجا گیا تو اُس وقت یہ جدوجہد صرف فکری تھی اور مادی جدوجہد اس میں شامل نہیں تھی۔ یہ حالت مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام تک جاری رہی جس کے بعد فوج اور اختیارات کو قائم کیا گیا اور تب رسول اللہ ﷺ نے مادی جدوجہد کو فکری جدوجہد کے ساتھ ملا دیا۔ جہاد سے متعلق آیات نازل ہوئیں اور جدوجہد مزید آگے بڑھی۔ یہ اسی طرح جاری رہے گی یعنی خونی کشمکش کے ساتھ فکری جدوجہد حتیٰ کہ وہ وقت آجائے کہ اس دنیا اور اس میں رہنے والے اسلام کے مطابق زندگی گزاریں۔ اسی وجہ سے کفر اسلام کا دشمن ہے اور اسی وجہ سے کفار مسلمانوں کے دشمن رہیں گے جب تک اس دنیا میں مسلمان و کفار اور اسلام و کفر باقی ہیں، یہاں تک کہ سب کو دوبارہ زندہ نہ کر دیا جائے۔ یہ حتمی اور مستقل حقیقت ہے۔ لہذا اس بات کا ادراک ہر وقت تمام مسلمانوں کو اپنی پوری زندگی میں واضح رہنا چاہیے اور اسی معیار پر مسلمانوں اور کفار کے درمیان اور اسلام و کفر کے مابین تعلقات کا موازنہ کرنا چاہیے۔

خالص فکری جدوجہد تیرہ سال تک جاری رہی ۔ یہ انتہائی سخت اور رونگٹے کھڑے کرنے والی کشمکش تھی۔ آخر کار اسلامی افکار نے کفریہ افکار کا خاتمہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کو فتح عطا فرمائی۔ مدینہ میں مسلمانوں کی عزت کی حفاظت کرنے والی اور اسلام کی ڈھال، وہ ریاست قائم ہو گئی جو جہاد کے ذریعے سے لوگوں میں ہدایت پھیلاتی ہے۔ آنے والی جنگوں میں اسلام و کفر کے درمیان اور مسلمانوں اور کفار کی افواج کے مابین سخت اور خونریز لڑائیاں لڑی گئیں۔ ان تمام جنگوں میں فتح مسلمانوں کو ہی نصیب ہوئی۔ تاہم مسلمانوں کو کچھ معرکوں میں شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ہمیشہ جنگ جیت جاتے اور چھ صدیوں تک لگاتار وہ ایک بھی جنگ نہیں ہارے بلکہ اس وقت کی تمام جنگوں میں کامیاب ہی رہے۔ اس پورے دور میں اسلامی ریاست اولین ریاست رہی۔ مسلمانوں کے علاوہ انسانی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا، بلکہ یہ صرف اسلامی ریاست ہی کے ساتھ ہوا، لیکن کفار، بالخصوص یورپی ممالک اسلام پر یلغار کرنے اور

مسلمانوں کے وجود کو تباہ کرنے سے غافل نہ تھے۔ لہذا جب کبھی ان کو موقع ملتا تو وہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاتے یا ان کے خلاف سازشیں کرتے۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر (گیارہویں صدی عیسوی) اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل (بارہویں صدی عیسوی) میں یورپی ممالک نے محسوس کیا کہ اسلامی ریاست کا حکومتی نظام بہت سے صوبوں میں بٹ چکا ہے اور کچھ والیوں کے بہت سے اہم اندرونی معاملات جیسے فوج، بیت المال اور اختیارات وغیرہ خود مختاری تک پہنچ چکے ہیں، یہاں تک کہ وہ سب ریاستیں آپس میں ایک واحد خود مختار ریاست کے بجائے ایک وفاقی نظام کی طرح نظر آنے لگیں۔ بعض ولایات میں تو خلیفہ کی حیثیت سوائے اس کے کچھ نہ رہی کہ منبر پر اس کے لئے دعا کی جائے، اس کے نام کے سکے ڈھالے جائیں اور خراج میں سے ایک معتبر حصہ اُس کو بھیجا جائے۔ یورپی ممالک نے اس کو محسوس کر لیا لہٰذا انہوں نے مسلمانوں پر صلیبی حملے شروع کر دیئے اور جنگ بھڑک اٹھی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور کفار نے بلاد شام کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا یعنی فلسطین، لبنان اور شام۔ ان علاقوں میں وہ کئی دہائیوں تک رہے یہاں تک کہ انہوں نے بعض شہروں جیسے طرابلس وغیرہ پر تقریباً سو سال تک قبضہ برقرار رکھا۔

اگرچہ صلیبیوں اور مسلمانوں کے درمیان جھڑپیں سو سال تک مسلسل چلتی رہیں اور اگرچہ مسلمانوں کی اپنے مقبوضہ علاقوں کو صلیبیوں سے واپس لینے کی کوششیں بھی سست نہیں پڑیں، تاہم ان جنگوں نے اسلامی ریاست کو غیر مستحکم کر دیا اور اسلامی ریاست کا وقار پہلے سے گر گیا۔ مسلمان جنگ ہار گئے اور کفار نے انہیں شکست دے دی۔ جنگ میں کامیابی مسلمانوں کے خلاف کفار کے حصے میں آئی۔ اگرچہ کفر کو اسلام پر فکری اور روحانی کامیابی تو حاصل نہ ہو سکی لیکن اس میں مسلمانوں نے وہ ذلت اور رسوائی اٹھائی جس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے صلیبی جنگوں کا دور مسلمانوں کی شکست کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے، اگرچہ آخر کار انہوں نے صلیبیوں پر کامیابی حاصل کر لی اور ان کو بلاد شام سے نکالنے میں بھی کامیاب ہو گئے لیکن وہ کفار کے خلاف اپنی فتوحات کا سلسلہ از سر نو شروع نہ کر سکے۔ یہ صلیبی جنگیں ابھی ختم نہ ہوئی تھیں کہ منگول پہنچ گئے اور بغداد میں قتل عام کا واقعہ پیش آیا۔ اس دھچکہ کی وجہ سے اسی سال، 656 ہجری بمطابق 1258 عیسوی میں، منگولوں کے ہاتھوں دمشق کا سقوط ہوا۔ پھر 3 ستمبر 1260

میں عین جالوت(Ayn Jaloot)کا معرکہ ہوا جہاں منگولوں کا قلع قمع ہوا۔اس فتح کے ساتھ ہی مسلمانوں کے دلوں میں دوبارہ جہاد کا جذبہ ابھرا اور انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ اسلامی دعوت کو پھر سے تمام عالم میں لے کر جایا جائے۔لہٰذا ایک بار پھر سے مسلمانوں کا کفار پر فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور بازنطینیوں(Byzantines) کے خلاف جہاد دوبارہ شروع ہو گیا۔ لڑائیاں شروع ہوئیں تو کامیابیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔یہ تقریباً ساتویں ہجری(تیرہویں عیسوی) کے لگ بھگ تھا جب اُمت مسلمہ نے دوبارہ سے فتوحات کا آغاز کیا۔ جنگیں شروع ہوئیں اور کئی معرکے وقوع پذیر ہوئے اور مسلمان ہر دفعہ فتح یاب ہو کر آتے تھے،اگرچہ بعض معرکوں میں مسلمانوں نے شکست بھی کھائی لیکن وہ جنگیں جیت جاتے اور علاقے فتح کر لیتے تھے۔اسلامی ریاست اولین ریاست تھی اور اس نے یہ اعلیٰ مقام چار صدیوں یعنی بارہویں صدی ہجری کے نصف (اٹھارویں صدی عیسوی) تک قائم رکھا۔ پھر یورپ میں زبردست صنعتی انقلاب کا ظہور ہوا جس نے ریاستوں کی طاقت کو متاثر کیا۔ مسلمان بوکھلاہٹ میں کھڑے دیکھتے رہ گئے اور پورے عالم میں طاقت کا توازن بگڑ گیا جس کے نتیجے میں اسلامی ریاست بھی آہستہ آہستہ اولین ریاست کے مقام سے گرنے لگی، یہاں تک کہ وہ لالچیوں کا مطمع نظر بن گئی۔لہٰذا وہ اپنے مفتوحہ علاقوں سے بھی دستبردار ہونے لگی اور ان علاقوں سے بھی جو پہلے اس کے اختیار میں تھے۔کافر ممالک اسلامی سرزمین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے غصب کرنے لگے اور یہاں سے مسلمانوں کے عروج کے اختتام بعد زوال کا آغاز ہوا۔اُسی وقت سے یورپی ممالک اسلامی ریاست کو عالمی منظر نامے سے ختم کرنے اور اسلام کو زندگی کے معاملات اور لوگوں کے تعلقات سے مکمل طور پر ختم کرنے پر تُل گئے۔دوسرے الفاظ میں انہوں نے نئے سرے سے صلیبی جنگوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔تاہم پہلی صلیبی جنگوں کی طرح نہیں کہ فوج کے ساتھ لشکر کشی کر کے مسلمانوں کو شکست دیں جس کے ساتھ ہی اسلامی ریاست کو بھی شکست ہو جائے بلکہ ایسی صلیبی جنگیں جو ان سے زیادہ گہری اور بھیانک ہوں جس میں وہ اسلامی ریاست کو جڑ سے ہی اکھیڑ دیں تا کہ اس کی کوئی باقیات ہی نہ رہیں اور نہ ہی کوئی ایسی جڑ باقی رہے جو دوبارہ اُگ سکے۔ان صلیبی جنگوں کی ایسی منصوبہ بندی کی گئی کہ اسلام کو مسلمانوں کے دلوں سے اکھاڑ پھینکیں تا کہ وہ چند رسم و رواج اور مذہبی علامت کے سوا کچھ نہ رہے۔

یورپی ممالک کی اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں

مسلم علاقوں کی تقسیم پر اختلاف کے باوجود کفار اسلام کے خاتمہ پر مکمل متفق تھے۔اس کے لئے انہوں نے مختلف طریقے اختیار کیے۔ابتدا میں انھوں نے یورپی ممالک میں قومیت اور خود مختاری کے جذبات کو ہوا دی۔انھوں نے لوگوں کو اسلامی ریاست کے خلاف اکسایا اور ان کو اس کے خلاف انقلاب برپا کرنے کیلیئے اسلحہ اور پیسہ فراہم کیا جیسے سربیا اور یونان میں ہوا۔اس طرح یورپی ممالک نے اسلامی ریاست پر پیچھے سے حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔فرانس نے مصر پر حملہ کر کے جولائی 1798 کو اس پر قبضہ کر لیا، پھر اس نے فلسطین کا رخ کیا اور اس پر بھی قابض ہو گیا۔فرانس باقی بلادِ شام پر بھی قبضے کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ اسلامی ریاست پر فیصلہ کن وار کرے لیکن کسی طرح وہ خود شکست کھا گیا جب بعد میں اسے مصر سے نکلنا پڑا اور قابض زمین بھی اسلامی ریاست کے حوالے کرنی پڑی۔

وہابیوں کا ظہور اور سعودی اقتدار:

برطانیہ نے اپنے ایجنٹ عبدالعزیز بن محمد بن سعود کے ذریعے اسلامی ریاست کو اندر سے ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔تب سے وہابیوں کو محمد بن سعود اور اس کے بعد اس کے بیٹے عبدالعزیز کی زیر قیادت اسلامی ریاست میں وجود بھی حاصل ہو گیا تھا۔ برطانیہ نے انھیں اسلحہ اور پیسہ فراہم کیا اور انھوں نے مسلکی بنیادوں پر خلافت کے زیرِ اختیار علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔انہوں نے خلیفہ کے خلاف تلوار اٹھالی اور انگریزوں کے اکسانے اور مدد سے اسلامی افواج (امیر المومنین کے لشکر) کے خلاف جنگ شروع کر دی۔وہابی خلیفہ کی حکومت سے زمین چھین کر اس پر اپنے مذہب (مکتبہ فکر) کے مطابق حکومت کرنا چاہتے تھے تاکہ ان سے اختلاف کرنے والے تمام اسلامی مذاہب کو بزورِ طاقت دبا سکیں۔لہٰذا انہوں نے کویت پر حملہ کیا اور اس پر 1788 میں قبضہ کر لیا، پھر شمال کی طرف پیش قدمی کی یہاں تک کے بغداد کا محاصرہ کر لیا۔وہ کربلا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار پر بھی قبضہ کر کے اُسے گرانا چاہتے تھے تاکہ لوگوں کو اُس کی زیارت سے روک سکیں۔پھر اپریل 1803ء میں وہ مکہ مکرمہ پر حملہ آور ہوئے اور

اس پر قبضہ کر لیا۔ 1804 کے موسم بہار میں مدینہ منورہ بھی ان کے زیر تسلط آ گیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر پر سایہ کرنے والے بڑے بڑے گنبدوں کو تباہ کر دیا اور ان کو تمام قیمتی پتھروں اور جواہرات سے خالی کر دیا۔ پورے حجاز پر قبضہ کرنے کے بعد وہ بلادِ شام کی طرف چلے۔ حمص کے قریب 1810 میں انہوں نے دمشق پر دوسری بار حملہ کیا اور نجف پر بھی حملہ آور ہو گئے۔ دمشق والوں نے بڑی بہادری اور شاندار طریقے سے اپنا دفاع کیا۔ تاہم دمشق کا محاصرہ کرتے ہوئے اُسی وقت وہابی شمال کی طرف بڑھے اور انہوں نے اپنی حکومت شام کے اکثر علاقوں حتیٰ کے حلب (Aleppo) تک قائم کر لی۔ بہر حال یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ یہ وہابی مہم انگریزوں کے اُکسانے پر کھڑی ہوئی تھی کیونکہ آل سعود برطانوی ایجنٹ تھے۔ انہوں نے وہابی مذہب سے ناجائز فائدہ اٹھایا جو کہ ایک اسلامی مذہب تھا اور اس کی بنیاد ایک مجتہد، محمد بن عبدالوھاب، نے رکھی تھی، اس مذہب کو سیاسی طور پر استعمال کرنے کا مقصد اسلامی ریاست کو نقصان پہنچانا اور دوسرے مذاہب کے ساتھ ٹکراؤ پیدا کرنا تھا تاکہ خلافتِ عثمانیہ میں فرقہ وارانہ جنگیں چھڑ جائیں۔ اس مذہب کے پیروکاروں کو اس کا ادراک نہ تھا لیکن سعودی امیر اور سعودی لوگ مکمل طور پر اس سے آگاہ تھے، کیونکہ یہ تعلق انگریزوں اور صاحب مذہب محمد بن عبدالوہاب کے درمیان نہ تھا بلکہ انگریزوں اور عبدالعزیز بن محمد بن سعود اور اس کے بعد اس کے بیٹے سعود کے درمیان تھا۔

محمد بن عبدالوہاب جو کہ حنبلی مذہب سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے بعض مسائل میں اجتہاد کیا تو دیکھا کہ دوسرے مذاہب کے بعض لوگوں کی رائے ان مسائل میں ان کی رائے سے مختلف ہے۔ لہذا انہوں نے اپنی آراء کی طرف دعوت دینا شروع کی، ان کے نفاذ کیلئے کوشش شروع کی اور دوسری اسلامی آراء پر سختی سے تنقید شروع کر دی۔ اس وجہ سے اُن کو بیشتر علماء، امراء اور لوگوں کی طرف سے تعارض اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو یہ سمجھتے تھے کہ اُن کی آراء اس سے مختلف تھیں جو ان لوگوں نے قرآن وسنت سے سمجھا تھا۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کرنا حرام اور باعثِ گناہ ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کرنے کے لیے سفر کرے تو اس کو سفر میں قصر نماز پڑھنا جائز نہیں کیونکہ وہ گناہ کا مسافر ہے۔ اس پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے استدلال کیا:

«لا تُشَدُّ الرِّحالُ إلا إلى ثلاثة مساجد: مسجدي هذا، والمسجد الحرام، والمسجد

الأقصى»" سفر کا ارادہ صرف تین مسجدوں کے لیے ہونا چاہیے، میری مسجد (مسجد نبوی)، مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ"۔ اس حدیث سے عبدالوہاب نے یہ سمجھا کہ ان تین مساجد کے علاوہ کسی طرف قصد کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ لہذا اگر رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کا ارادہ کیا گیا تو گویا کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ کا ارادہ کیا گیا، تو یہ حرام اور گناہ ہوگا۔ جبکہ دوسرے مذہب والوں کی رائے کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کرنا سنت اور مندوب عمل تھا جس کے کرنے والے کو ثواب ملے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«كنتُ نَهيتُكم عن زيارة القبور أَلاَ فزُورُوها»** "میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب تم زیارت کر سکتے ہو"۔ رسول اللہ ﷺ کی قبر بدرجہ اولیٰ اس بات کی مستحق ہے کہ اس حدیث میں شامل ہو، اس پر مستزاد دیگر احادیث بھی ہیں جن کو وہ روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے اس حدیث کے متعلق جس سے محمد بن عبدالوھاب نے استدلال کیا، کہا کہ یہ حدیث صرف مساجد کے ساتھ خاص ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا موضوع مساجد کی طرف جانے کا ارادہ کرنے سے متعلق ہی ہے اور اس سے زیادہ نہیں۔ یہ حدیث عام نہیں بلکہ خاص ہے اور ایک مخصوص موضوع سے متعلق ہے یعنی **«لا تُشَدُّ الرِّحالُ إلا لثلاثة مساجد»** "سفر کا ارادہ صرف تین مسجدوں کے لیے ہونا چاہیے"۔ لہذا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ استنبول میں آیا صوفیا مسجد یا دمشق میں اموی مسجد کی زیارت کیلئے جائے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے مساجد کی زیات کو تین مساجد تک محدود کر دیا ہے۔ ان تین کے علاوہ کسی چوتھی مسجد کیلئے قصد کرنے کی اجازت نہیں۔ لہٰذا یہ مساجد کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے علاوہ تجارت، ملاقات، تفریح اور سیر جیسے دیگر وجوہات کیلئے سفر کرنا جائز ہے۔ لہٰذا یہ حدیث سفر سے مطلقاً منع کر کے ان تین مساجد تک محدود نہیں کرتی بلکہ کسی مسجد کی زیارت کے ارادہ سے ان تینوں کے علاوہ کسی مسجد کی طرف سفر سے روکتی ہے۔ اسی طرح دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے ان کی آراء کو غلط اور قرآن اور سنت سے حاصل کی گئی سمجھ کے خلاف سمجھا۔ جلد ہی اُن کے اور لوگوں کے درمیان اختلافات شدت اختیار کر گئے اور اُن کو ملک بدر کر دیا گیا۔

1740 میں انہوں نے قبیلہ عنزہ (Anzah) کے شیخ محمد بن سعود کے ہاں پناہ لی جن کے عیینہ (Uyaynah) کے شیخ سے اچھے تعلقات نہیں تھے اور الدرعیہ (Al-Dir'iyyah) کے شہر میں مقیم تھے جو عُیینہ سے صرف چھ گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ محمد بن عبدالوھاب کا بہت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ اُنھوں نے الدرعیہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کے لوگوں میں اپنی آراء اور افکار کو پھیلانا شروع کیا۔ کچھ عرصے میں ان کی آراء وافکار کے بہت سے پیروکار اور حمایتی پیدا ہو گئے۔ امیر محمد بن سعود بھی ان افکار کی طرف مائل ہوا اور شیخ (محمد ابن عبدالوھاب) کے قریب ہونے لگا۔

1747 میں امیر محمد نے محمد بن عبدالوھاب کی تمام آراء اور افکار کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ ان آراء و افکار کے ساتھ شیخ کیلئے اپنی حمایت و نصرت کا بھی اعلان کیا۔ اس اتحاد کی بنیاد پر وہابیوں کی تحریک قائم ہو گئی جو ایک دعوت اور حکومت کی شکل میں ظاہر ہوئی، محمد بن عبدالوھاب اس کی طرف دعوت دیتے تھے اور اس کے احکامات سکھاتے تھے جبکہ محمد بن سعود ان لوگوں پر یہ احکامات نافذ کرتا تھا جو اُس کے حکم اور اختیار کے ماتحت تھے۔

الدرعیہ اور اس کے گردونواح کے علاقوں اور قبائل میں وہابی تحریک کی دعوت اور حکومت پھیلنے لگی۔ محمد بن سعود کی امارت بھی پھیلنے لگی یہاں تک کہ صرف دس سال کی مدت میں وہ اپنی سلطنت اور نئے مذہب کیلئے تقریباً تیس مربع میل کا علاقہ اپنے اختیار میں کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم یہ وسعت دعوت کے طریقے اور عنزہ کے شیخ کے اختیارات کے ذریعہ سے حاصل ہوئی تھی۔ کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی اس کی مخالفت کی، حتیٰ کہ احساء (Al- Ihsaa) کے امیر جنہوں نے محمد بن عبدالوھاب کو عُیینہ سے نکال دیا تھا انہوں نے بھی اس پھیلاؤ پر اپنے دشمن سے تعارض نہ کیا اور اپنی فوج کو 1757 آنے تک بھی لڑائی کیلئے اکٹھا نہ کیا۔ لیکن وہ شکست کھا گیا اور محمد بن سعود نے اس کی امارت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے نتیجے میں عنزہ کا اقتدار اور نئے مذہب کی حکومت محمد بن سعود کے توسط سے الدرعیہ اور اس کے ارد گرد کے علاقے بشمول احساء تک پھیل گیا۔ اس طریقے سے وہابی مذہب ان علاقوں میں بزورِ طاقت نافذ کیا گیا۔

لیکن احساء کے حاکم کے ساتھ تصادم اور اس کے علاقوں پر قبضے کے بعد وہابی تحریک رک گئی۔اس کے بعد اس میں توسیع یا اس کی کسی سرگرمی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔یہ صرف اسی علاقے تک محدود رہی۔محمد بن سعود بھی اس حد تک پہنچ کر رک گیا اور وہابی مذہب بھی اس علاقے کی سرحدوں پر رک گیا اور تحریک تقریباً سو ہی گئی اور جمود کا شکار ہو گئی۔

1765 میں محمد بن سعود فوت ہو گیا۔عنزہ میں اس کا جانشین اس کا بیٹا عبد العزیز بنا۔وہ اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلا اور اپنے زیر اثر علاقوں پر حکومت جاری رکھی۔لیکن تحریک کیلئے کوئی سرگرمی نہ دکھائی اور نہ ہی ارد گرد کے علاقوں میں اس کی کوئی توسیع کی۔لہٰذا تحریک سوئی رہی اور جمود نے اس پر خیمے گاڑ دیئے۔اس کے بعد نہ ہی اس کے بارے میں تذکرہ سنا گیا اور نہ ہی ارد گرد کے علاقوں نے اس کے پھیلاؤ کے خوف کو محسوس کیا۔

تاہم وہابی تحریک کے آغاز کے اکتالیس برس بعد یعنی 1747 سے لے کر 1788 تک اور اس تحریک کے رکنے اور جمود کے اکتیس برس بعد (1757ء سے لیکر 1787ء) اچانک اس کی سرگرمیاں دوبارہ شروع ہو گئیں۔انہوں نے مذہب کو پھیلانے کا ایک نیا طریقہ اختیار کر لیا اور اسلامی ریاست کے ہر علاقے میں اور اس کی سرحدوں کے باہر بھی اس تحریک کا بول بالا ہوا اور دوسری عالمی طاقتوں تک بھی اس کی خبریں پہنچیں۔تحریک نے اپنے ارد گرد کے پڑوسیوں کو تشویش میں مبتلا کرنا شروع کر دیا بلکہ خود اسلامی ریاست بھی پریشان اور بے چین ہو گئی۔

1787 میں عبد العزیز نے امارت کی بنیادیں رکھنا شروع کیں اور حکومت میں موروثیت کا نظام ایجاد کیا یعنی جو ولایت کے عہد (ولی عہد) کے نام سے موسوم ہے۔اس سے یقین دہانی ہو گئی کہ سعود کا اپنا بیٹا اس کا جانشین بن سکے۔لوگوں کا ایک بڑا مجمع شیخ محمد بن عبد الوہاب کے زیر سرپرستی جمع ہوا اور اس بڑے مجمع میں عبد العزیز نے امارت کا حق اپنے خاندان کیلئے مخصوص کر لیا اور امارت میں جانشینی کا حق اپنی اولاد کیلئے مخصوص کر لیا،اور اپنے بیٹے سعود کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا اعلان کیا۔محمد بن عبد الوہاب کی قیادت میں اس پورے مجمع نے اس اعلان کی حمایت کی اور اس کو قبول کر لیا۔اس طرح کسی قبیلے یا بہت سے قبیلوں کی جگہ ایک ہی خاندان کو حکمرانی کیلئے منتخب کر لیا گیا۔اسی طرح وہابی

مذہب کی جانشینی کیلئے بھی محمد بن عبدالوھاب کے گھر کو مخصوص کیا گیا۔جب امارت اور مذہب کی جانشینی کیلئے تقرری کا طریقہ طے ہو گیا تو تحریک کو نئی زندگی مل گئی اور انہوں نے توسیع اور فتوحات کا کام دوبارہ شروع کر دیا۔انھوں نے اپنے مذہب کو پھیلانے کیلئے ایک بار پھر جنگ کا سہارا لیا۔1788 میں عبدالعزیز نے فوجی کاروائی کیلئے ایک بڑی فوج تیار کی۔اُس نے کویت پر حملہ کیا اور اُس کو فتح کرکے اس پر قابض ہو گیا۔اس سے پہلے برطانیہ کویت کو خلافتِ عثمانیہ سے لینے کی کوشش کرچکا تھا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا، کیونکہ دوسرے ممالک جیسے جرمنی، روس، فرانس وغیرہ اس کے لئے رکاوٹ بن جاتے تھے اور خود خلافتِ عثمانیہ بھی اس کے مقابلے میں ڈٹ جاتی تھی۔خلافتِ عثمانیہ سے کویت کا کٹ جانا اور پھر اس کی حفاظت کیلئے شمال کی طرف بڑھنے نے بڑے ممالک جیسے روس، جرمنی اور فرانس کے ساتھ ساتھ خلافتِ عثمانیہ کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔اس کے علاوہ یہ جنگ جس کی بنیاد مسلک پرستی تھی، اس کے ذریعے لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھارا جا رہا تھا۔

اس طرح کئی دہائیوں کے جمود کے بعد وہابیوں نے اپنی سرگرمیاں اچانک دوبارہ شروع کر دیں۔انہوں نے اس تحریک کا آغاز ایک نئے طریقے سے کیا، یعنی مذہب کو جنگ کرکے اور علاقے فتح کرکے پھیلانا تاکہ دوسرے مذاہب کا وجود ختم کر دیں اور ان کو اپنے مذہب سے تبدیل کر دیں۔اپنی سرگرمیوں کا آغاز انہوں نے کویت پر حملہ اور اس پر قبضہ کرنے سے کیا۔پھر پھیلاؤ کے اس طریقے کو انہوں نے کئی دفعہ استعمال کیا۔اس بنیاد پر وہ عرب میں موجود اپنے پڑوسیوں یعنی عراق، شام اور خصوصاً خلافتِ عثمانیہ کیلئے تشویش اور پریشانی کا باعث بن گئے۔وہابی مذہب کی آراء کو نہ اپنانے پر وہ مسلمانوں کے خلاف بھی جنگ کیلئے تلوار اٹھا لیتے تاکہ وہ وہابی مذہب کے افکار کو گلے لگائیں۔وہ خلیفہ کے ساتھ لڑنے لگے اور اسلامی سرزمین کو فتح کرنے لگے۔پھر 1792 کو جب محمد بن عبدالوھاب فوت ہو گئے تو ان کا بیٹا ان کے منصب پر ان کا جانشین بنا جس طرح کے سعود اپنے باپ عبدالعزیز کا جانشین بنا تھا۔اس طرح سعودی حکمرانوں نے وہابی مذہب کو خلافتِ عثمانیہ پر حملوں اور مسلمانوں میں مذہبی جنگیں چھیڑنے کیلئے بطور ایک سیاسی آلہ استعمال کیا۔

اسلامی ریاست کے خلاف برطانیہ کی سازش:

آلِ سعود کا برطانیہ کا ایجنٹ اور وفادار ہونا ریاستِ خلافت اور دیگر ممالک جیسے جرمنی، فرانس اور روس کیلئے واضح تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ اُن کو برطانیہ اُکسا رہا ہے ہیں۔ برطانیہ نے خود بھی اس حقیقت کو کبھی نہیں چھپایا تھا کہ انہوں نے سعودیوں کی بحیثیت ریاست مدد کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلحہ کی ایک بڑی کھیپ اور زبردست سازوسامان جوان کو ہندوستان کے راستے سے پہنچ رہا تھا اور وہ اخراجات جن کی جنگ میں ضرورت پڑتی ہے اور اس کے ذریعے فوج کو مسلح کیا جاتا ہے یہ سب کا سب انگریز کا ہی اسلحہ اور مال تھا۔ لہذا دیگر یورپی ممالک بالخصوص فرانس وہابی تحریک کے مخالف تھے کیونکہ اسے ایک برطانوی مہم سمجھا جاتا تھا۔ ریاستِ خلافت نے وہابیوں کی تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ رک نہ سکی اور مدینہ، بغداد اور دمشق میں اس کے والی ان کو قابو کرنے سے عاجز ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں ریاست نے مصر کے والی محمد علی کو حکم دیا کہ وہ ان سے نمٹنے کیلئے ایک لشکر بھیجے۔ شروع میں اس نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ چونکہ وہ فرانس کا ایجنٹ تھا جس نے اس کو مصر میں حکومت الٹانے اور پھر اقتدار پر قبضہ کرنے میں اس کی مدد کی تھی اور پھر خلافت کو اس کے اقتدار کے اعتراف پر مجبور کیا تھا۔ لہٰذا فرانس کی اجازت اور اُبھارنے پر اس نے سلطان کے حکم پر 1811 میں لبیک کہا اور اپنے بیٹے طوسون (Tosson) کو وہابیوں کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا۔ وہابی اور مصری افواج کے درمیان بہت سے معرکے ہوئے، اور 1812 میں مصری افواج مدینہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ پھر 1816 میں محمد علی نے اپنے بیٹے ابراہیم کو قاہرہ سے بھیجا جس نے وہابیوں کا بالکل صفایا کر دیا حتی کہ انہوں نے اپنے دارالحکومت الدرعیتہ میں پناہ لی اور وہیں محصور ہو گئے، جہاں ابراہیم نے اپریل 1818 میں اُن کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ پورے موسم گرما میں جاری رہا حتیٰ کہ ستمبر 1818 میں وہابیوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ابراہیم کی فوج نے الدرعیہ کو مکمل طور پر تباہ کر رکھ دیا۔ یہ کہا جاتا تھا کہ اس نے ہل کے ساتھ زمین ہموار کر دی تاکہ ان کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ اس کو برطانوی سازشوں کا خاتمہ سمجھا گیا۔

فرانس کی ریاستِ اسلامیہ کو ختم کرنے کی کوشش:

فرانس نے بھی اپنے ایجنٹ، مصر کے والی، محمد علی کے ذریعہ ریاستِ اسلامیہ کو پیچھے سے ضرب لگانے کی کوشش کی۔ فرانس نے عالمی اور سیاسی محاذ پر کھلم کھلا اُس کی حمایت کی جس بناء پر وہ خلیفہ سے علیحدہ ہو گیا اور اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ 1831 میں اُس نے بلادِ شام پر قبضہ کرنے کے مقصد سے اُس کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اُس نے فلسطین، لبنان اور شام پر قبضہ کر لیا اور انتولیہ (Anatolia) میں گھسنا شروع کر دیا، لیکن خلیفہ نے اس کے خلاف لڑنے کیلیئے ایک طاقتور فوج بھیجی۔ برطانیہ، روس اور جرمنی کی دو ریاستیں بھی محمد علی کے خلاف ہو گئیں۔ جولائی 1840 میں برطانیہ نے روس اور جرمنی کی دو ریاستوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو بعد میں "چار ملکی معاہدہ" کے نام سے مشہور ہوا، جس کے تحت انہوں نے یہ عہد کیا کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کی سرزمین کی وحدت کا دفاع کریں گے اور محمد علی کو بزورِ طاقت مجبور کیا جائے گا کہ وہ شام کو خالی کر دے۔ یورپی ممالک کی طرف سے اس موقف نے عالمی منظرنامے کو خلیفہ کے حق میں تبدیل کر دیا۔ اس سے محمد علی کے خلاف مزاحمت میں مدد ملی اور اسے فلسطین، شام اور لبنان سے بے دخل ہو کر مصر واپس آنا پڑا۔ پھر وہ خلیفہ کا ایک تابعدار والی بننے پر راضی ہو گیا۔

قومیت کے نعرے بھڑکانا اور علیحدگی کے جذبے کو اکسانا

اسی طرح خلافتِ اسلامیہ کو وجود سے ختم کرنے کے لیے یورپی ممالک بالخصوص برطانیہ، فرانس اور روس کی کوششیں جاری رہیں۔ لیکن ان کی زیادہ تر کوششیں منظم فوجوں، جنگوں اور لڑائیوں کے ساتھ ریاستِ اسلامیہ پر پیچھے سے حملہ کرنے پر مرکوز رہیں، لیکن یہ ناکام ہو گئیں۔اس ناکامی کی وجہ صرف خلیفہ کی دفاعی طاقت نہ تھی بلکہ اس وقت کی عالمی صورت حال اور غنائم کی تقسیم پر ان ممالک کا آپس میں اختلاف اس کا اصل سبب بنا۔

بہر حال وہ کوششیں جو انہوں نے یورپی ممالک یعنی سربیا، ہنگری، بلغاریا اور یونان وغیرہ میں کیں، وہ کامیاب ہوئیں کیونکہ وہاں انہوں نے قومیتوں کے نعرے اور علیحدگی کے رجحان ، جس کو وہ آزادی کہتے تھے، کے اسلوب کو اختیار کیا۔اس لئے یورپی ممالک نے یہی طریقہ یعنی قومیتوں کے نعروں کے ذریعہ اشتعال دلانا اور آزادی کے رجحانات،اسلامی ریاست کے تمام علاقوں میں اختیار کیا جہاں اسلام کا جھنڈا لہراتا تھا اور خلیفہ کا حکم چلتا تھا۔ عربوں اور ترکوں پر ان کی خاص توجہ تھی۔ استنبول اور اسلامی سرزمین کے بڑے علاقوں میں برطانوی اور فرانسیسی سفارتخانوں نے یہ جذبات اکسانا شروع کیے یعنی قومیت کے نعرے اور علیحدگی کے رجحانات بھڑکانا۔ ان کی سرگرمیاں بغداد، دمشق، بیروت، قاہرہ اور جدہ میں نمایاں تھیں۔ان سرگرمیوں کے لیے دو مرکزی دفتر قائم کیے گئے، ایک استنبول میں تاکہ ریاستِ اسلامیہ کے مرکز میں ضرب لگائی جا سکے اور دوسرا بیروت میں تاکہ اردگرد کے علاقوں میں اور بالخصوص ان شہروں میں جہاں کے باشندے عربی زبان بولتے تھے ان پر ضرب لگائی جائے۔

خلافت کے خلاف بیروت کے مرکز کا کردار:

جہاں تک بیروت کے مرکز کا تعلق ہے، یہ اسلام اور ریاستِ اسلامیہ کو ضرب لگانے کیلئے کفر کا مرکز تھا اور اس کو طویل مدت کے منصوبے دیے گئے تاکہ اُس سے دوررست نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ جہاں تک استنبول کے مرکز کا تعلق ہے، تو اس کے لئے چھوٹی مدت کا منصوبہ تیار کیا گیا تاکہ جلد از جلد نتائج حاصل کیے جائیں لیکن جن کے

دوررست اثرات ہوں۔ لٰہذا بیروت کا مرکز زہر قاتل تھا کیونکہ اس نے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان نوجوانوں کو کافر بنایا اور اسلامی تعلقات کو عمومی طور پر ان تعلقات سے بدل دیا جو کفریہ احکامات کے مطابق استوار ہوں۔ پہلی عالمی جنگ میں ریاستِ اسلامیہ کے کفار کے ساتھ ٹکراؤ کا اثر خوفناک تھا۔

شامی علاقوں سے ابراہیم پاشا کے انخلاء کے فوراً بعد ہی بیروت میں مغربی کافروں نے سیاسی کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔1842 میں ایک کمیٹی، امریکیوں کی قیادت میں ان کے مقاصد کے لیے سائنسی تحقیق کے نام پر تشکیل دی گئی۔ وہ کمیٹی اپنے پروگرام کے مطابق تقریباً پانچ سال تک چلتی رہی یہاں تک کہ 1847 میں ایک اور تنظیم کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو گئی جس کا نام "The Science and Arts Association" رکھا گیا۔ اس تنظیم کو چلانے اور اس کی نگرانی کی ذمہ داری دو عیسائیوں کو دی گئی جو برطانیہ کے خطرناک ترین ایجنٹ تصور کیے جاتے تھے۔ بطرس البستانی اور ناصیف الیازجی، جن کی پشت پر برطانیہ سے کرنل چرچل تھا اور امریکہ سے ایلی سمیتھ(Eli Smith) اور کورنیلوس وین ڈیک(Cornilos Van Dick) تھے۔ شروع میں اس تنظیم کے اہداف مبہم تھے، تاہم انہوں نے یہ تاثر دیا کہ ان کا مقصد نوجوانوں میں سائنسی علوم پھیلانا ہے جیسے اسکول بچوں کو تعلیم دیتے ہیں تاکہ بڑوں کو بھی چھوٹوں کی طرح مغربی ثقافت سے ہم آہنگ کریں، ان کو مغربی افکار دیں تاکہ ان کو ایک مخصوص سمت میں موڑا جائے۔ لیکن اس تنظیم کے اہلکاروں کی سرگرمیوں اور سخت کوششوں کے باوجود دو سال کے دوران پورے بلادِ شام میں اس تنظیم کے ساتھ صرف پچاس ممبر شامل ہو سکے جو کہ تمام کے تمام عیسائی تھے اور زیادہ تر بیروت کے رہائشی تھے۔ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس تنظیم کا ممبر نہ بنا۔

1850 میں ایک اور تنظیم "الجمعیۃ الشرقیہ" (Eastern Association) کے نام سے بنائی گئی۔ اس کی بنیاد مسیحی عیسائیوں نے فرانسیسی عیسائی پادری "ہنری ڈبریز" (Henri Debrinier) کے زیر نگرانی رکھی۔ اس کے تمام ممبران بھی عیسائی تھے۔

پھر 1857 میں ایک اور نئ تنظیم کو نئے طریقے سے تشکیل دیا گیا اور اس میں یہ خیال رکھا گیا کہ عرب کے علاوہ کوئی غیر ملکی اس میں شامل نہ ہو سکے، اس کے تمام بانی بھی عرب تھے۔ اس لئے اس کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے ممبران میں مسلمانوں اور بعض دروز (Druze) کو عرب ہونے کے ناطے شامل کریں۔ اس لئے تقریباً ڈیڑھ سو ممبران کی ایک بڑی تعداد اس تنظیم میں شامل ہوئی اور ان میں عرب کی بعض معروف شخصیات جیسا کہ دروز میں سے محمد ارسلان، مسلمانوں میں سے حسین بیھم اور عیسائیوں میں سے ابراہیم الیازجی اور بطرس البستانی کا بیٹا شامل تھے ۔ آخری دو نے ہی اس فکر کو اپنایا اور اس کے لیے کام کیا۔ اس تنظیم کی کامیابی نے کفار کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ قومیتوں کے نعروں اور علیحدگی کے جذبات کو کھلم کھلا ابھار سکیں تا کہ سائنسی علوم کی آڑ لیے بغیر اور کسی ہیر پھیر اور دھوکہ کے بغیر اعلانیہ طور پر کام کریں۔

1875 میں بیروت میں ایک خفیہ تنظیم قائم ہوئی جس کی بنیاد ان پانچ نوجوانوں نے رکھی جو بیروت کے پروٹسٹنٹ کالج سے تعلیم یافتہ تھے۔ یہ سب کے سب عیسائی تھے اور لوگوں کی تھوڑی سی تعداد بھی ان کے ساتھ ہو گئی تھی۔ اس جماعت نے اپنے آپ کو ایک سیاسی فکر پر مرکوز کر لیا۔ یہ سیاسی جماعت کے طور پر قائم ہوئی جسے عرب قومیت کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا۔ اسلامی سرزمین پر اس تنظیم کو سب سے پہلی سیاسی جماعت شمار کیا جاتا ہے جو عرب قومیت کی فکر کی بنیاد پر قائم کی گئی ہو۔ یہ جماعت عرب کو عربیت اور قومیت کی طرف دعوت دیتی تھی۔ انہوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف نفرت کو ابھارا اور اُسے "ترک" ریاست کا نام دیا۔ انہوں نے ریاست کو دین سے جدا کرنے پر کام کیا اور عرب قومیت ہی کو وحدت کی بنیاد بنایا تا کہ مسلمانوں میں رائج اسلامی عقیدے سے وفاداری کو عرب قومیت کی طرف پھیر دیں۔ وہ اکثر اوقات پمفلٹ بھی جاری کرتے رہتے جن کو پوشیدہ طور پر تقسیم کیا جاتا۔ ان کے بعض پمفلٹوں میں ان کی تعبیرات کے مطابق ترکی پر تہمتیں ہوتیں کہ انہوں نے عربوں سے خلافت کو چھین لیا ہے اور وہ شریعت سے تجاوز کرتے ہوئے دین میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس جماعت کو قائم کرنے والے اور اس کے ذمہ داران عیسائی تھے جو اسلام سے بغض رکھتے تھے۔ یوں قومیتوں کی تحریکات پھیلنا شروع ہو گئیں اور اس کے ساتھ قومیت کا

نعرہ بھی پھیلنے لگا۔ لیکن یورپی ممالک نے جو بنیادی مقصد بیروت کے مرکز سے حاصل کیا وہ جاسوسوں کی بھرتی تھی جس کا مقصد افکار اور اقدار کو تباہ کرنا تھا۔ تاہم اس تنظیم کا مقام سیاسی حیثیت میں دقیانوسی تھا لیکن اس کے اثرات فکری طور پر تباہ کن تھے۔

استنبول کے مرکز کا خلافت کے خلاف کردار:

یہ تو بیروت کے مرکز کے متعلق تھا۔ جہاں تک استنبول کے مرکز کا تعلق ہے،اس کو مغربی کفار نے ریاستِ اسلامیہ کے دار لخلافہ اور حکمران طبقے پر ضرب لگانے کیلئے استعمال کیا۔ کفار نے بہت سے اقدامات کیے جن میں سے سب سے اہم اور بھیانک کاروائی "نوجوان ترک"(Young Turks) جیسی تنظیم کا قیام تھا جو"اتحادوترقی"(Union and Progress)کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس جماعت کا قیام پیرس میں ان ترک نوجوانوں نے کیا تھا جو فرانسیسی افکار سے مرعوب تھے اور انہوں نے انقلابِ فرانس کا بہت گہرا مطالعہ کرر کھا تھا۔ اس کی بنیاد ایک خفیہ انقلابی جماعت کے طور پر رکھی گئی۔ اس انقلابی جماعت کا روح رواں "احمد رضا بک"(Ahmed Redha Beik)تھا۔ وہ لوگوں میں نمایاں شخصیت شمار کیا جاتا تھا اور مغربی ثقافت کو ترکی میں لانے کی سوچ رکھتا تھا۔ اس جماعت کی دیگر شاخیں برلن، سلانیک اور استنبول میں بھی قائم کی گئیں۔

پیرس کا مرکز تنظیمی اعتبار سے بہت منظم تھا،اس کے مقاصد انقلابی تھے اور اُس کے نشر واشاعت کے ذرائع جن پر اُس کا انحصار تھا، انتہائی مضبوط تھے۔ اس کا"The News" کے نام سے اپنا اخبار تھا جو استنبول میں یورپی ڈاک کے ساتھ سمگل کیا جاتا، جس کو پھر ترکوں کی ایک جماعت وصول کرتی اور اس کو خفیہ پھیلانے کا اہتمام کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ سیاسی پمفلٹ بھی چھاپتے اور ان کو بھی اسی طرز پر پھیلاتے تھے۔ اس کی برلن والی شاخ اعتدال پسندوں، سابقہ ریاستی وزراء، بڑے بڑے افسران اور سیاسی فہم رکھنے والے لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ اصلاحات کا مطالبہ کرتے تھے کہ حکومت کے امور کو جرمنی کے حکومتی نظام کے مطابق چلایا جائے۔ انہوں نے ایسے بہت سے گروہوں

کو یکجا کر کے، جن پر عثمانی سلطنت مشتمل تھی، اُن کے مابین جرمنی کے وفاقی نظام کی طرز پر وفاقی نظام بنانے کا مشورہ دیا۔

جہاں تک سلانیک کی شاخ کا تعلق ہے، اس کے زیادہ تر ممبران تعلیم یافتہ لوگ تھے جو فوج کے اندر کافی اثرورسوخ رکھتے تھے۔ وہ دن رات انقلاب کی تیاریاں کرتے تھے۔ ان کے ساتھ بعض شیوخ بھی شامل کیے گئے جس سے ان کی طاقت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس طرح ان کے ساتھ کچھ چھوٹے افسران بھی شامل ہو گئے جیسے طلعت جو بعد میں وزیر اعظم بنا۔ لیکن اس کے باوجود وہ پیرس کے مرکز کے تابع تھے اور اس کی آراء کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے۔ پیرس کا مرکز ہی انہیں مغربی نظریات اور افکار دیتا تھا اور جدوجہد اور لگن کے جذبات ابھارتا تھا۔

فری میسن (Masonic lodges) کی تنظیمیں، بالخصوص سلانیک میں عظیم اطالوی کلباس تنظیم کی سرگرمیوں کو خوش آمدید کہتا اور ادبی اعتبار سے ان کی پوری مدد کرتا تھا۔ اجلاس فری میسن تنظیم کے کلبوں میں ہوتے تھے جہاں پر جاسوسوں کیلئے شدید کوشش کے باوجود بھی پہنچنا محال تھا۔ ان کلبوں کے ممبران کی ایک کثیر تعداد "اتحاد و ترقی" (Union & Progress) کی جماعت سے منسلک تھی۔ اس طریقے سے کمیٹی نے اپنے آپ کو منظم کرتے ہوئے اپنی تعداد اور اثرونفوذ کو اُس امداد کے ذریعہ بڑھایا جو ان کو باہر سے حاصل ہوتی تھی۔ مزید برآں اتحاد و ترقی کے ممبران استنبول کے ساتھ رابطے کیلئے فری مشنری طریقوں سے بھی فائدہ اٹھاتے تھے تاکہ اُن کے روابط استنبول اور دار خلافہ کے ساتھ مضبوط ہوں۔

اس تنظیم یعنی (Young Turks) یا "اتحاد و ترقی" نے خفیہ طور پر اجلاس منعقد کرنا شروع کر دیے اور انقلاب کی تیاری شروع کی۔ اسی نہج پر چلتے ہوئے اُنہوں نے 1908 میں بغاوت کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اِن کی قوت ظاہر ہو گئی اور یورپ نے اس کے متعلق اپنی رضامندی بھی ظاہر کر دی۔ 1908 کے موسم خزاں میں، پارلیمنٹ کے افتتاح سے کچھ عرصہ قبل، سلانیک میں اس جماعت کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ چیلنج کے ساتھ قوت کے مظاہرے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس وقت جماعت کا سربراہ اس کا فارسی بانی احمد رضا بک ہی تھا۔ اس نے

کانفرنس کے شرکاء سے خطاب کیااور تنظیم کی کامیابی اور اُن کے جوش ولولہ پر اپنی خوشی کااظہار کیا۔اُس نے یقین دہانی کروائی کہ یورپی ممالک نے بذات خود اس قومیت کی تحریک کیلیئے اپنے نیک جذبات کا اور ملک کی موجودہ صورتحال پر اطمینان کااظہار کیا ہے۔

اس وقت یعنی1908 کے موسم خزاں ہی میں برطانیہ نے استنبول میں اپنے ایک نئے سفیر "جیرالڈلوتھر(Gerald Luther)"کو متعین کیا۔جب وہ استنبول پہنچاتو"اتحادوترقی"کی جماعت نے اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا، حتیٰ کہ انہوں نے گھوڑوں کوان کی بگھیوں سے نکالااور بگھی کو خود کھینچنے لگے۔ یہ سب کچھ "اتحادوترقی" کمیٹی کے پیشگی اقدامات اوراثر کی وجہ سے ہوا تھا۔ کمیٹی کے افراد کو مغربی افکار نے اتنا مسحور کردیا تھا کہ وہ اس حد تک پہنچ گئے کہ انہیں اس بات کاادراک ہی نہ ہوا کہ یہ افکاراُن کی موجودہ ریاست کی حقیقت کے مخالف ہیں اور نہ ہی اس بات کاادراک کیا کہ یہ اسلام سے بھی متصادم ہیں۔ان کی غفلت اوراندھاپن کی وجہ سے یورپی اُن کی اس جہالت کی طرف متوجہ ہوئے، یہاں تک کہ اس وقت کے ایک سیاسی ماہر نے ان کے متعلق استنبول میں کہا" یہ اکثرپہلے قدم سے پہلے دوسرا قدم اٹھالیتے ہیں"۔اتحاد وترقی کے کارکنوں نے مغربی افکاراور مغربی قوانین میں رنگے ہوئے افراد کو تمام کاموں کی لگام تھمانے میں بھی جلدی کی، یہاں تک کہ(Young Turks) تنظیم میں بھی ان کودسترس حاصل ہوگئی۔

جب انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو کوئی بھی فوج کی قیادت کو اپنا ہم خیال بنالے گا تو وہ طاقت کا مالک بن جائیگا تو انہوں نے کوشش کی کہ نئی تقرریاں پارٹی پالیسی کے مطابق ہوں۔ جس کی وجہ سے وہ تمام افسران جن کو تکنیکی اور جنگی ماہر بننا تھا،جماعت کے ممبران بن گئے۔انہوں نے یہ قانون بھی متعارف کیا کہ خلافتِ عثمانیہ کی رعایا میں سے ہر شہری کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو ترکوں کو عثمانی ریاست میں حاصل ہیں اور ان کے بھی وہی فرائض ہیں جو ترکوں کے ہیں۔

اس تنظیم نے پوری ریاست پر، اس کے حال اور مستقبل پر اختیار حاصل کر لیا۔ اس طرح وہ فکر جس کو مغرب نے اسلامی ریاست اور خلافت کو ختم کرنے کیلئے استعمال کیا تھا اُس کا پھل آنا شروع ہو گیا۔ اس فکر کو طاقت ان صاحبِ اقتدار لوگوں اور اُن کے حمایتیوں کی وجہ سے ملی جو یہ سمجھتے تھے کہ اسلام اس زمانہ کیلئے کار آمد نہیں ہے بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تمام تر کامیابی مغربی افکار اور مغربی ثقافت میں ہے۔ جماعت کے رُکن کی حیثیت سے وہ ترک قومیت کی حفاظت کو اپنے اہم فرائض میں سے سمجھتے تھے، حتیٰ کہ اس سے وفاداری کو تمام وفاداریوں سے بالاتر سمجھا گیا۔ لہذا قومیت کو اُبھار کر توجہ اس قدر بدلی گئی کہ ترکی اور ترکوں کو باقی اسلامی ممالک اور مسلمانوں سے برتر تصور کیا جانے لگا۔

اس لئے نوجوان ترک (Young Turks) اور اتحاد و ترقی (Union & Progress) کی جماعت کا قیام مغرب کا وہ بھیانک عمل تھا جو انہوں نے اسلامی ریاست اور اسلام پر ضرب لگانے کیلئے کیا۔ اس کے نتائج بھی اُتنی ہی جلدی ظاہر ہوئے، جیسے ہی اِس جماعت نے اقتدار کی لگام کو اپنے ہاتھ میں لیا تو یہ تباہ کن کدال اسلامی ریاست کے جسم پر بڑی تیزی سے چلنے لگا اور ایک ایسی خندق کھدنے لگی جس پر کوئی پل نہ بنایا جا سکے۔ اس لئے کہ قومیت وہ خطرناک ترین چیز ہے جو لوگوں میں تقسیم، عداوت، بغض اور جنگ وجدل پیدا کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ ریاست کے تمام شہریوں کیلئے تنظیم سے وابستگی پر کوئی روک ٹوک نہ تھی لیکن اتحادیوں کی قومیت کی پالیسی نے ہی عثمانی ریاست میں قومیت کی فکر کو دعوت دی۔ اس لئے البانیہ (Albanians) والوں نے آستانہ (Astana) میں اپنی ایک تنظیم بنالی، شرکس (Circassians) اور کرد (Kurds) بھی اُن کی پیروی میں اُن سے پیچھے نہ رہے۔ اس سے پہلے روم اور آرمینیا میں بھی خفیہ جماعتیں منظم ہو چکی تھیں جن کو انہوں نے قانونی بنالیا۔

ان سب کی دیکھا دیکھی عرب بھی کھڑے ہو گئے اور انہوں نے آستانہ میں ایک تنظیم "عرب عثمانی بھائی چارا" (Arab-Ottoman Brotherhood) قائم کی اور اس تنظیم کے کلب بھی اِسی نام سے کھولے گئے۔ لیکن "اتحاد و ترقی" کی تنظیم عربوں کے خلاف خاص طور پر تعصب سے کام لینے لگی کیونکہ انہوں نے تمام قومیتوں کو نسلی گروہ بندیوں میں بٹنے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن ساتھ ہی وہ عرب تنظیموں کی مخالفت بھی کرنے

لگی۔اِس وجہ سے انہوں نے اس عرب تنظیم کو تحلیل کر دیااور حکومتی حکم نامے سے اس کے کلب کو بھی بند کر دیا ۔اُنہوں نے افواج کے اندر بھی نسلی امتیاز کو ہوا دی۔انہوں نے تمام عرب افسروں کواُن کے شہروں سے استنبول بلانا شروع کیااوراُن کوافسران کیلئے جرمنی میں ہونے والے تعلیمی مشن(Academic Mission)میں شرکت سے بھی منع کر دیا۔انہوں نے"اتحاد وترقی"کی مرکزی کمیٹی میں بھی عرب ممبران کے داخلہ پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیاجبکہ اس جمعیت(Committe)میں شمولیت خلافتِ عثمانیہ میں بسنے والے تمام شہریوں کیلئے کھلی تھی،اس میں کسی ترک، عرب،البانی یاشرکسی(Circassian)کوفوقیت حاصل نہ تھی۔تاہم جب یہ پارٹی اقتدار پر قابض ہوئی جس میں ترکوں کواثرورسوخ حاصل تھاتووہ جابرانہ طور پر اپنی آراء نافذ کرنے لگے اور کمیٹی کے اہم عہدوں سے عربوں کو محروم کر دیااوراس تنظیم کوایک ترک تنظیم بنانے لگے۔اس کے بعد انہوں نے حکومتی فیصلوں میں بھی من مانیاں شروع کر دیں جیسے عرب وزیر سے وزارتِ اوقاف چھین کر تُرک وزیر کو دے دی اور جان بوجھ کر وزارتِ داخلہ وخارجہ ترکوں کو سونپ دی۔ عرب ریاستوں میں جان بوجھ کر ترک والی بھیجناشروع کیے جن میں سے اکثریت ان کی تھی جوکہ عربی زبان بھی نہیں جانتے تھے۔

پھرانہوں نے رہی سہی کسر ترک زبان کو سرکاری زبان بنا کر پوری کر دی حتیٰ کہ عربی زبان کی صرف ونحو(گرائمر) کو بھی ترک زبان میں سکھانے لگے۔ ان کی عربی زبان کے ساتھ ناپسندیدگی اس حد تک بڑھ گئی کہ 1909 میں واشنگٹن میں خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے ایک سفیر نے اعلان کیاجس میں اس نے امریکامیں مقیم عثمانی باشندوں کو سفارت خانے سے ترکی زبان کے علاوہ کسی زبان میں بات چیت کرنے سے منع کر دیا،یہ جاننے کے باوجود کہ امریکہ میں خلافتِ عثمانیہ کے باشندوں کی تعداد پانچ لاکھ سے کم نہیں ہے اور ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ترک زبان جانتاہو۔

مسلح افواج میں موجود عرب اور ترک نوجوانوں میں یہ نسلی تعصب واضح طور پر بڑھتا جا رہا تھا۔وہ ترک افسران جو"اتحاد وترقی"سے منسوب تھے،اس تعصب کواپنے معاملات، ترقیوں اور فوج میں اعلیٰ عہدے لینے کیلئے

خاص طور پر اچھالتے تھے۔ عرب افسران نے اس پر ناگواری کا اظہار تو کیا لیکن ان کے دل میں خلافتِ عثمانیہ کیلئے وفاداری کے متعلق کوئی شک نہ تھا، کیونکہ یہ مسئلہ عربوں اور ترکوں کے اتحاد ہی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ ایک امت مسلمہ اور استنبول میں موجود اُن کے خلیفہ کا تھا جس کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے واجب اور اس کی نافرمانی کو حرام قرار دیا ہے، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے جو نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ ہی اس پر ظلم کرتا ہے۔ اس لیے جب بعض عرب افسران اس رویے سے متاثر ہوئے تو1909 کے اواخر میں انہوں نے "اتحاد و ترقی" تنظیم کے اہلِ قوت ممبران سے ملاقات کی درخواست کی جو انہوں نے کچھ عرصے کے بعد قبول کرلی اور استنبول میں اکٹھے ہو کر ایک طویل ملاقات کی۔ اس ملاقات میں خاص طور پر اُن امور پر بحث کی گئی جس کے ذریعے عرب و ترک مخالفت کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے اکھاڑ دیا جایے۔ قریب تھا کہ اس ملاقات سے وحدت کو بحال کرنے، نسلی تعصب کو ختم کرنے اور اُمت کی وحدت کیلئے صرف اسلامی عقیدہ کے گرد اکٹھے کرنے کا نتیجہ برآمد ہوتا، لیکن بعض تُرک نوجوان جن پر تُرک قومیت کا بھوت اسلامی عقیدہ کی محبت سے زیادہ سوار تھا، جیسے "احمد آغا بیک" اور "یوسف اقشورہ بک" بشمول دیگر کو یہ بات ناگوار گزری کہ وہ اپنی قومیت کو چھوڑ کر صرف اسلام کی اطاعت کریں۔ لہذا انہوں نے اس معاملہ میں مداخلت کی اور عربوں کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے اور ترکوں کی تعریف کی جس سے یہ ملاقات اس سے بھی زیادہ خطرناک موڑ پر ختم ہوئی جہاں سے اسکا آغاز ہوا تھا۔

کمیٹی اپنی پالیسی پر عمل پیرا رہی اور جب تمام اُمور میں ترکوں کیلئے فضا بالکل ہموار ہو گئی تو انہوں نے تنظیم کے منشور میں ترمیم کر کے اس کو خالص تُرکوں کی جماعت بنا دیا۔ اس ردوبدل کے نتیجہ میں تمام عرب اراکین نے اِستعفٰی دے دیا جس کے ساتھ ہی البانوی، آرمینیائی اور وہ تُرک اراکین بھی ان سے علیحدہ ہو گئے جن کے نزدیک قومیت کی جگہ صرف اسلام کا عقیدہ ہی ہر چیز کی بنیاد تھا۔

عرب تنظیموں اور جمعیتوں کے قیام میں یورپی ایجنسیوں کا کردار:

ان واقعات کے نتیجہ میں یورپی ممالک کے سفارتخانوں نے عرب کے ساتھ رابطوں اور وہاں پر تنظیموں اور انجمنوں کے قیام کیلئے سرگرمیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے "حزب اللامرکزیۃ"(Decentralization Party) کی بنیاد رکھی جس کا مرکز قاہرہ اور رفیق العظم اس جماعت کا صدر تھا۔ اسی طرح بیروت میں "جمعیۃ الاصلاح"(Reforms Party)بنائی گئی اور "المنتدی الادبی"(Literal Forum)بنایا گیا۔ فرانسیسی اور انگریز عربوں کی صفوں میں گھس گئے جو قومیت کی ذہنیت سے بھرے ہوئے تھے اور اُن کے لئے اپنی ریاستوں کے خزانے کھول دیے۔18 جون 1913 کو عرب کے نوجوانوں نے فرانس کے زیر نگرانی پیرس میں ایک کانفرنس منعقد کی جو برطانیہ اور فرانس کے ساتھ وابستگی اور خلافتِ عثمانیہ کے خلاف عرب اقوام کی کامیابی کا پہلا اعلان تھا۔

جب "اتحاد وترقی" کے افراد نے یہ محسوس کیا تو انہوں نے ایک نئی تنظیم بنائی جس کا نام انہوں نے (Turk Ojaghi Committe)یعنی ترک خاندان رکھا۔ اس کا مقصد اسلام کو مٹانا اور عثمانی عناصر کو تُرک میں بدلنا تھا۔ پھر انہوں نے ملحدانہ (atheistic) کتابوں اور رسالوں کو چھاپنے کی حوصلہ افزائی کی، جیسے ترکی کے مشہور کاتب جلال نوری ہک کی کتاب جس کا نام "تاریخ المستقبل"(The History of the Future)تھا، جس میں اس نے لکھا، "آستانہ کی حکومت کیلئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شامیوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کرے۔ تُرک زبان کو پھیلانے اور اِس کو لازمی طور پر دین کی زبان بنانے کے لیے عرب سرزمین، خاص طور پر عراق اور یمن کو ترک کالونیوں میں بدل دیا جائے۔ اپنے وجود کی بقاء کیلئے ہمارے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم عرب کے تمام ممالک کو ترُک ممالک میں بدل دیں، اس لیے کہ موجودہ عرب نسل نسلی عصبیت کو محسوس کرنے لگی ہے جو ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں جس کے لیے ہمیں ابھی سے تیار رہنا چاہیے"۔ قومیت اور وطن پرستی کی طرف جھکاؤ نے ذہنوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ اسلام سے وفاداری قومیت اور وطن پرستی سے وفاداری میں بدل گئی۔ یہ محبت اِس حد تک بڑھ گئی کہ اسلام کو قومیت اور وطن پرستی کیلئے خطرہ سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کے ریاست کے اندر اقتدار

سنبھالنے والوں کے لیے معیار اسلام کی بجائے قومیت اور وطنیت تھا حتی کہ جب عرب ترک وحدت کا نعرہ لگایا گیا تو اُس وقت بھی پسِ پُشت فلسفہ یہی تھا۔

علاوہ ازیں جمال پاشا، جب وہ شام میں تھا، اس چیز کا مشاہدہ کر چکا تھا کہ عرب نوجوان فرانس اور برطانیہ کی رہنمائی میں خلافتِ عثمانیہ کے خلاف غداری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اُس کا یہ شک یقین میں بدل گیا جب دمشق میں فرانسیسی قونصل خانہ میں اس سے متعلق دستاویزات ضبط کیے گئے۔ وہ ریاست میں عوام کے مابین اتحاد قائم رکھنے کے لیے عربوں کو جیتنا چاہتا تھا۔ اس نے عرب رہنماؤں کو دمشق کے ایک جلسے میں دعوت دی جس میں اُس نے تقریر کی اور اُن کو متحد ہونے کی تلقین کی۔ اُس نے جو کہا اس میں سے کچھ یہ ہے، "تمہیں اس حقیقت کا یقین کر لینا چاہیے کہ "ترک تنظیم" کی تحریک جس کا تم نے آستانہ اور دیگر جگہوں پر مشاہدہ کیا جو ترک عناصر سے رچی بسی ہوئی ہے، کسی طرح سے بھی عرب مقاصد سے نہیں ٹکراتی۔ تمہیں بغیر کسی شک و شُبہ کے یہ بھی علم ہے کہ عثمانی سلطنت بلغاریہ، یونانی، آرمینیائی جیسی بہت سی تحریکوں کے بننے کے عمل کا مشاہدہ کر چکی ہے اور اب اس میں عرب تحریک موجود ہے۔ ترک اپنے وجود کو اس حد تک بھول چکے تھے کہ مطلقاً اپنی ذات کے تذکرہ سے بھی ڈرتے تھے۔ وطن پرستی کا جذبہ بالکل سو گیا تھا حتٰی کہ ترک قوم کے متعلق یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مکمل بکھر جائیں گے۔ اس آنے والے خطرہ کو چیلنج سمجھ کر کچھ لوگ (Young Turks) جوش کے ساتھ کھڑے ہو گئے جو کہ قابلِ تعریف ہے۔ لہٰذا انہوں نے ہتھیار اُٹھائے اور ترکوں کو قوم پرستی کی تعلیم دینے لگے"۔ اس نے پھر کہا، "آج مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں یہ تصدیق کروں کہ ترک تمنائیں اور عرب تمنائیں بالکل ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتیں بلکہ عرب اور ترک اپنی حب الوطنی کے مقصد میں بھائی بھائی کے علاوہ کچھ نہیں"۔ اس نے مزید کہا، " اس جماعت یعنی (Young Turks) کے مقاصد کی تکمیل یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کے ترک قوم کو دنیا کی تمام اقوام میں عزت کا درجہ دلوائیں اور اُس کا بھی اتنا حق ہو کہ وہ بیسویں صدی کی اقوام کے درمیان اپنی جگہ بنا سکے"۔

ان الفاظ کے ساتھ جمال پاشا نے مسلمانوں کی وحدت کو خلافتِ اسلامیہ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ عربوں کو اُن محرکات سے باز رکھے جو وہ برطانوی اور فرانسیسی کافروں کی مدد سے ترکوں یا خلافت سے علیحدگی کے لیے کر رہے تھے۔

یہ کہنا ٹھیک ہے کہ جمال پاشا ان غداروں کو پھانسی دینے میں حق پر تھا جو کہ خلافت کے خلاف فرانس اور برطانیہ کیلئے کام کر رہے تھے کیونکہ اُس کی نظر میں وہ کافر تھے یا ایسے غدار مسلمان جو اسلام کی نامناسبت (unsuitability) کے قائل تھے۔ ہر غدار کے خاتمے پر بھی وہ برحق تھا اور جو کوئی بھی خلافت کے خلاف کام کرے، اگرچہ وہ خود بھی وطنیت پرستی کی ہی دعوت دے رہا تھا، اور وہ تو اس سے بڑھ کر ہے جو خلافت کے خلاف کافروں کے ساتھ مل کر اور ان کے اشاروں پر کام کر رہا تھا۔ لیکن جمال پاشا اور اتحاد و ترقی (Young Turks) کی جماعت، دونوں ہی وطنیت پرستی کی طرف بلانے پر سزا اور جیل کے مستحق تھے۔ حالات کو قابو کرنے کیلئے یہ خطاب بالکل غلط تھا اور قومیت کی بنیاد پر علیحدگی کا کم از کم اس طریقہ سے علاج نہیں کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ خطاب نے بذاتِ خود فاسق عقائد کی موجودگی کی نشاندہی کی اور اس بات سے اِعراض کیا گیا کہ صرف اسلام ہی وہ ربط (bond) ہے جو لوگوں کو اکٹھا کر سکتا ہے اور صرف یہ واحد عقیدہ ہی خلافت کی بنیاد ہے۔

وہ کلمات جو اُسے کہنے چاہیے تھے اور ضروری تھے کہ وہی قطعی اور حرفِ آخر ہوتے اور اُس کے علاوہ وہ کچھ نہ کہتا، وہ یہ کہ اسلامی عقیدہ ہی ہم تمام لوگوں کی وفاداریوں کا محور ہونا چاہیے۔ اس کے سواء کسی اور کیلئے وفاداری نہیں ہونی چاہیے۔ صرف یہی عقیدہ ہی ہمارے اعمال کا معیار ہو، لیکن یہ کہنے کے بجائے اس نے عربی زبان بولنے والے مسلمانوں کو اپنے اس قول سے پرسکون کرنے کی کوشش کی، "ترک تمنائیں اور عرب تمنائیں بالکل ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتیں"، اور یہ کہہ کر، "بلکہ عرب اور ترک اپنی حب الوطنی کے مقصد میں بھائی بھائی کے علاوہ کچھ نہیں"، اور یہ بھی کہہ کر، "اس جماعت یعنی (Young Turks) کے مقاصد کی تکمیل یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کے ترک

قوم کو دنیا کی تمام اقوام میں عزت کا درجہ دلوائیں اور اُس کا بھی اتنا حق ہو کہ وہ بیسویں صدی کی اقوام کے درمیان اپنی جگہ بنا سکے"، یعنی برطانوی، فرانسیسی، اطالوی اور یونانی، دوسرے الفاظ میں کفار کے درمیان اپنی جگہ بنا سکے۔

مسیحی تبلیغی اور ثقافتی حملے

اس طرح خلافت کے دار الخلافہ میں قوم پرستی کے نعرے اور حب الوطنی کا تعصب پھیلانے کے بہت سے طریقے بار آور ثابت ہوئے۔ یورپی ممالک بالخصوص برطانیہ اور فرانس کو ریاستِ اسلامیہ کو ہولناک اور بھیانک ضرب لگانے میں زبردست کامیابی ہوئی۔ تاہم یورپی ممالک بالخصوص برطانیہ نے ان خطرناک اور شدید بھیانک نتائج کے باوجود صرف اسی ایک طریقے پر اکتفاء نہ کیا۔ بلکہ سولہویں صدی کے اواخر سے اسلام کے خلاف انہوں نے ایک اور طریقہ بھی اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ دشمنی جو اِن کے دلوں میں جوش مار رہی تھی اور وہ بغض جو ان کے سینوں کو کھائے جا رہا تھا وہ اسلامی افکار اور اس کے احکامات کے خلاف تھا۔ اس لئے انہوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا جس کا مقصد اسلامی عقائد اور اسلامی شریعت پر ضرب لگانا تھا۔ استنبول اور بیروت ہی دو نمایاں مراکز تھے جن کو انہوں اڈہ بنا لیا تھا اور پھر انہوں نے قاہرہ کو بھی ایک مرکز بنانے کی کوشش کی۔

بیروت کے مرکز کیلئے یہ منصوبہ وضع کیا گیا جس کے دور رست اثرات ہوں، یعنی نوجوانوں کو اسلام کے خلاف تیار کرنا اور عام مسلمانوں کے افکار پر اثر انداز ہونا۔ اس کام کیلئے وہ سائنسی علوم کے نام پر عیسائیت کی تبلیغ اور اسلامی ثقافت پر حملے کے ذریعہ آگے بڑھے جس کے لیے انہوں نے خطیر رقوم مختص کیں۔ لہٰذا انہوں نے مشنری تنظیمیں قائم کیں جن میں زیادہ تر برطانوی، فرانسیسی اور امریکی تنظیمیں تھیں۔ ثقافتی حملہ بھی انہوں نے مسیحی تبلیغ اور مبلغوں کے ذریعہ کیا تاکہ عیسائی شہریوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکیں اور مسلمانوں کے دین میں شکوک پیدا کر سکیں اور ان کے عقائد کو ہلا سکیں۔

مسیحی تبلیغ کے حملے میں مالٹا کے مرکز کا کردار:

کفار نے سولہویں صدی کے آخر میں مالٹا میں مسیحی تبلیغ کا ایک بہت بڑا مرکز قائم کیا گیا جس سے مسلم ریاستوں پر مسیحی تبلیغ اور ثقافتی یلغار کیلئے اڈے کا کام لیا گیا۔ وہیں سے مشنری مشن بھیجے جاتے تھے۔ کچھ عرصے تک وہ

یہیں ٹھہرے رہے لیکن جلد ہی انہیں اپنے کام کو پھیلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہذا1625 میں وہ بلادِ شام منتقل ہوگئے اور وہاں سے بھی مشنری تحریکیں شروع کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن وہاں ان کی سرگرمیاں محدود رہیں اور وہ بعض چھوٹے مدارس کے قیام اور چند مذہبی کتب کی نشرو اشاعت سے آگے نہ بڑھ سکے۔انہیں مسلمان اور عیسائیوں، دونوں کی طرف سے بہت مزاحمت، کنارہ کشی اور جھگڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 1773 تک وہ محفوظ رہے جس کے بعد مسیحی تبلیغ کی جماعتوں کو عیسائیوں کیلئے ختم کر دیا گیا اور ان کی تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی سوائے ان چند جماعتوں کے جو کمزور تھی جیسے عازارین(Azariyyin) مشنری۔

مسیحی مبلغین کے وفود کا بلادِ شام میں پھیلنا:

مسیحی مبلغ تنظیموں کی موجودگی کے باوجود ان مبلغوں کا اثر ماند پر گیا اور اُن کی سرگرمیاں مالٹا تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ تاہم 1820 میں ان کی سرگرمیاں دوبارہ شروع ہوئیں اور بیروت میں عیسائی تبلیغ کا پہلا مرکز قائم ہوا۔ انکی تمام تر توجہ مسیحی تبلیغ اور مذہبی ثقافت پر مرکوز تھی اور تعلیم پر توجہ کم ہی تھی۔ 1834 تک پورے بلادِ شام میں مشنری وفود پھیل گئے۔ یہ سب کچھ ابراہیم پاشا کی حوصلہ افزائی، اس کا عیسائی مبلغین کیلئے اپنے شہروں کے لیے دروازے کھولنے، ان سے ہمدردی رکھنے اور فرانس کے زیرِ اثر اس کی ہدایات کے مطابق ان کی حمایت کرنے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اس وقت تک وہ بلادِ شام پر قابض ہو چکا تھا یعنی فلسطین، لبنان اور شام۔ اس وجہ سے مسیحی مبلغین کو ابراہیم پاشا کی حکوت نے بہت جوش و خروش سے خوش آمدید کہا اور اُن کی کافی آؤ بھگت کیا گیا، جس وجہ سے ان کی سرگرمیوں میں بھی شدت آگئی تھی۔ لبنان کے گاؤں "عینطورہ"(Ainturah) میں ایک کالج کھولا گیا اور امریکی مشنریوں نے اپنا چھاپا خانہ مالٹا سے بیروت منتقل کر لیا تاکہ کتابوں کی چھپائی اور نشرو اشاعت ہو سکے۔ امریکا کا بدنام مسیحی مبلغ "ایلی سمتھ" ان میں سب سے زیادہ متحرک دکھائی دیا۔ یہ مبلغ مالٹا میں مسیحیت کی تبلیغ رضاکارانہ طور پر کرتا تھا اور چھاپہ خانے کا نگران تھا۔ وہ 1827 کو بیروت آیا لیکن مسلمانوں کی طرف سے خوفزدہ رہا اور نتائج نہ حاصل ہونے کی وجہ سے اکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔ وہ اس صورتحال کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا اور واپس مالٹا لوٹ گیا۔ پھر 1834 کو دوبارہ

بیروت آیا جب بیروت محمد علی اور اس کے بیٹے ابراہیم کے توسط سے فرانس کے زیر اثر آچکا تھا۔ اس مبلغ اور اس کی بیوی نے عورتوں کیلئے ایک اسکول کھولا، پھر اسی کام کو وسعت دی۔ اس نے اپنی زندگی کو خصوصاً بیروت اور عموماً بلادِ شام میں کام کرنے کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اس طرح ان تمام کوششوں نے مسیحیوں کو تبلیغ کی تحریک چلانے میں مدد دی۔

ابراہیم پاشا نے جس تعلیمی نصاب کو شام میں نافذ کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا وہ مصر میں پہلے ہی سے نافذ تھا، جو فرانس کے تعلیمی نصاب سے تبنی کیا گیا تھا۔ مشنریوں نے اس کو غنیمت سمجھا اور تعلیمی تحریکوں میں مسیحی تبلیغ کے نقطہ نظر سے حصہ ڈالنا شروع کر دیا جو کہ کفار کے منصوبہ کے عین مطابق تھا۔ پھر اس میں وسعت آئی اور طباعت(Press Movement) کی تحریک بھی ساتھ شامل ہو گئی۔ اس طرح مسیحی تبلیغ متحرک ہوئی اور ایک سازش کے تحت تعلیمی تحریکوں میں بھی شامل ہو گئی۔

بلادِ شام کے لوگوں میں فتنے پیدا کرنا:

جب 1840 میں ابراہیم پاشا نے بلادِ شام سے انخلاء کیا تو بلادِ شام اور مغربی سفارتکاروں میں پریشانی، افراتفری اور بے چینی پھیل گئی، بالخصوص مشنریوں نے خلافتِ عثمانیہ کے اثر و رسوخ کی کمزوری کو غنیمت سمجھا اور عوام میں فتنے کی آگ بھڑکانا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ 1860 کا قتلِ عام کا واقعہ پیش آیا۔ اس قتلِ عام کی آڑ میں مغربی ممالک نے مداخلت کی اور بلادِ شام کے ساحلوں کی طرف اپنے بحری بیڑے روانہ کر دیے۔ فرانس نے تو بیروت پر زمینی فوج بھی اُتاری جس سے مبلغین کا اثر و رسوخ بڑھ گیا اور ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ فرانس اسکول اور کالج کھولنے میں سرگرم ہو گیا اور مسیحیوں نے بھی اپنے اسکول اور کالج کھولنا شروع کیے جن میں عیسائی کالج "جامعة القديس يوسف اليسوعية"(St Joseph Jesuit University) شامل ہے۔ 1866 میں امریکیوں نے بھی ایک پروٹسٹنٹ کالج کھولا جو کہ آج بیروت میں "الجامعة الامريكيه"(American University of Beirut) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسلم سرزمین پر خطرناک ترین ادارہ شمار کیا گیا کیونکہ اس نے اسلامی افکار اور

مسلمانوں کے خلاف سخت مہمات چلائیں اور مسلمانوں کے ہزاروں نوجوانوں کی تابعداری کو کفریہ افکار کی طرف موڑنے میں کامیاب ہوا۔

ان مسیحی تبلیغ اور ثقافتی حملوں کا اہتمام کا معاملہ صرف امریکا، فرانس اور برطانیہ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اور بھی بہت سے کافر ملک اس میں شامل ہو گئے جیسے کہ روس جس نے کئی تبلیغی وفود بھی بھیجے۔ایک جرمن مہم جو کہ NUNS پر مشتمل تھی، اس نے بھی دوسرے عیسائی مبلغین کے وفود کے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف کردار ادا کرنے میں حصہ لیا۔ مشنریوں اور مغربی وفود کے سیاسی معاملات پر نقطہ نظر میں اختلاف کے باوجود وہ اپنے مقصد میں ایک تھے۔ یہ مغربی ثقافت کو مشرق میں منتقل کرنا چاہتے تھے، یعنی ریاست کی دین سے علیحدگی کے عقیدہ کو ریاستِ اسلامیہ کے مسلمانوں کا عقیدہ بنانا، مسلمانوں میں دین کے متعلق شکوک پیدا کرنا، ان کو اُبھارنا کہ وہ اپنی تاریخ کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھیں اور مغرب اور اس کی تہذیب و تمدن کو شاندار انداز میں پیش کرنا۔ اور یہ سب اُن کا اسلام سے بغض اور مسلمانوں سے نفرت کی وجہ سے تھا۔

ان اسکولوں اور کالجوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے شہروں میں ایک تحریک چلائی جو کہ لوگوں کو عربی زبان کی طرف متوجہ کرتی تھی تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اسلام سے ہٹا کر اس طرف لگائیں جس کا نام انہوں نے "عرب پرستی" رکھا تھا۔ اس کے علمبردار بھی عیسائی ہی تھے حالانکہ وہ عربی زبان کو سمجھنے سے بھی قاصر تھے کیونکہ انہوں نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کو ہی نہیں سمجھا تھا۔ ان مسیحی وفود کے اکثر خادم قدیم ادب کے احیاء پر اور قدیم عرب زبان کے اوصاف کی طرف لوٹنے پر بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ ان میں ناصیف الیازجی اور فادر لویس شیخو (Father Louis Sheikho) شامل تھے۔ اس طرح عیسائیوں نے عرب قوم پرستی کی مہم کی سربراہی کی اور لوگوں کو اس کو اپنانے پر اُبھارا۔ اسی طرح عربی زبان کو پھیلانے اور لوگوں کو اپنی توجہ اس تک محدود رکھنے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں اور تالیفات شائع کرنا شروع کر دیں جو کہ مغربی افکار سے مرتب ہوتیں اور ایک زبردست منصوبہ بندی کے ذریعے عرب، عرب پرستی اور عربی زبان سے محبت کو ہوا دی، اس کے

ساتھ اسلام اور اسلامی افکار کو بھی شدید طریقے سے ضرب لگائی۔ اس طرح بیروت کے مرکز نے اسلامی عقائد اور افکار پر ضرب لگائی اور لوگوں کو مغرب اور مغربی افکار کی طرف موڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس مرکز نے وہ خطرناک نتائج حاصل کیے جس نے اسلام کو رشتوں، معاملات، زندگی گزارنے کے طریقے سے ختم کیا اور آخر میں ریاستِ اسلامیہ کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مغربی آئین کے قوانین متعارف کرنے کی کوشش

جہاں تک استنبول مرکز کا تعلق ہے، مغربی ممالک نے مسلمان بچوں کو اسکول، کالجوں اور پروپیگنڈہ کے ذریعہ گمراہ کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے خاص طور پر ریاستِ اسلامیہ کے حکومتی نظام اور شرعی احکامات کے بدلنے کو بنیادی مرکز بنایا تاکہ اُنہیں ختم کیا جائے اور مغربی قوانین سے بدلا جائے۔ اس کے حصول کے لئے انہوں نے بہت سے اسالیب اختیار کیے۔ 1839 میں عبدالمجید اول نے خلافت سنبھالی جب اُن کی عمر صرف سولہ برس تھی، جبکہ رشید پاشا اُس وقت لندن میں خلافتِ عثمانیہ کا سفیر تھا۔ جونہی اسے اطلاع ملی وہ جلدی سے استنبول پہنچا جہاں اسے وزیر خارجہ بنادیا گیا۔ اس نے یہ منصب سنبھالتے ہی پارلیمانی نظامِ حکومت کیلئے تحریک چلانی شروع کی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کو دیگر ترقی یافتہ ممالک کے مقام تک پہنچانے کا پختہ ارادہ کیے ہوئے ہے، ایک ایسے آئین کے ذریعہ جو شہریوں کے حقوق پر مبنی ہوگا، نیز اُس نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ریاست میں موجود نمایاں کمیوں کوتاہیوں کو ختم کرے گا۔ رشید پاشا نے اپنے منصوبہ کی تکمیل کیلئے بڑی آسانی سے نوجوان سلطان کی تائید حاصل کرلی اور انتہائی خفیہ طور پر آئین کا مسودہ تیار کیا گیا۔

13 نومبر 1839 کو تمام چوٹی کے اشرافیہ، استنبول کے شہریوں کے نمائندے، یورپ میں خلافتِ عثمانیہ کے نمائندے اور سفارتی وفود کے ممبران کو مرمارا (Marmara) سمندر کے ساتھ موجود سرکاری دولت خانے کے جنوبی حصے میں پر مدعو کیا گیا تاکہ وہ "معزز دستاویز" پڑھ کر سنائی جائے جو کہ کلخانہ (Kalkhanah) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے آئینی حصہ کو ان کے سامنے پڑھا گیا۔ اس کا بیشتر حصہ یورپی قوانین پر مشتمل تھا جس میں اسلام کو بھی کچھ گنجائش دی گئی تھی۔ اور یہ حکومت کے نظام میں مغربی قوانین کو متعارف کروانے کی پہلی کوشش تھی۔ لیکن یہ دستور صرف کاغذی کاروائی تک ہی محدود رہا اور اس کو نافذ نہ کیا جا سکا۔ لیکن یورپی ممالک، بالخصوص برطانیہ نے 1855 میں خلافتِ عثمانیہ پر زور ڈالا کہ وہ ان آئینی اصلاحات کو نافذ کرے۔ ان ریاستوں کے دباؤ میں آکر سلطان

نے یکم فروری کو اصلاحات کا مسودہ جاری کر دیا جو کہ "مسودہِ ہمایوں" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس اعلامیہ میں بادشاہ نے ان تمام حقوق کی تائید کی جو کہ "کلخانہ" میں لوگوں کو عطا کیے گئے تھے۔

عیسائیوں کیلئے بھی حقوق متعین کیے گئے جیسا کہ انتظامی معاملات کو ایک مشترکہ مجلس (Select Committee) کی طرف بھیجا جائے گا جو کہ شہریوں، مولویوں اور ان لوگوں پر مشتمل ہوگی جن کو عوام نے براہ راست منتخب کیا ہو، نیز یہ کہ کسی بھی مسلمان کو عیسائیت اختیار کرنے کے بعد دوبارہ اسلام کی طرف لوٹنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا بلکہ اس کے لئے اسلام کو چھوڑنے اور عیسائی دین قبول کرنے کی اجازت ہوگی۔ مسلمانوں کی طرح عیسائیوں کیلئے بھی فوج میں سروس لازمی قرار دی گئی جو اس سے پہلے صرف مسلمانوں ہی کیلئے ضروری تھی۔ نیز غیر ملکیوں کو خلافتِ عثمانیہ میں جائیداد کے مالک بننے کی اجازت بھی دے دی گئی۔

اس بل پر عوام کی طرف سے منفی تاثر آیا کیونکہ مسلمانوں کو یہ شریعت کے مخالف نظر آیا جبکہ عیسائی بھی اس کے نفاذ سے متعلق پریشان تھے۔ اس کے باوجود یورپی ممالک اس کو اصلاحات کا نام دے کر اس کے پیچھے لگے رہے ۔تاہم ریاست کے اسلامی ہونے کی وجہ سے خلفاء ان آئینی قوانین کو نافذ نہ کر سکے۔ صورتحال ایسی ہی رہی یہاں تک کہ سرکاری حلقوں میں مدحت پاشا کا نام اُبھرنے لگا جو کہ مغربی افکار سے سرشار تھا اور مغربی تہذیب و تمدن کا دلداہ تھا۔ لہذا اس نے ایک ایسا آئین تیار کرنے کا پختہ ارادہ کیا جو مغربی افکار کے موافق ہو تا کہ مغربی ممالک بھی راضی ہو جائیں اور خلافتِ عثمانیہ بھی مغربی ممالک کے ساتھ برابری پر چل سکے۔

مدحت پاشا کی مغربی نظام سے خلافتِ عثمانیہ کیلئے آئین وضع کرنے کی کوشش:

خلیفہ عبدالعزیز کے دورِ خلافت میں محمد رشدی پاشا کی حکومت میں مدحت پاشا وزیر انصاف تھا۔ اس نے کوشش کی کہ ریاست کے لیے مغربی جمہوری نظام سے آئین تیار کرنے پر عبدالعزیز کو قائل کیا جائے۔ اس نے اسے ایک خط لکھا جس میں اس نے ملک میں آئین بنا کر حالات درست کرنے کا مطالبہ کیا۔ ریاست کی موجودہ صورتحال کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد اس خط میں اس نے یہ لکھا، "عزت مآب آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مرض کا علاج

اُس کی جڑ کو اکھاڑ دینے سے ہو گا جس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ جب اسباب زائل ہو جاتے ہیں تو مرض بھی زائل ہو جاتا ہے۔ لہذا جب آپ نے "ہمایوں دستاویز" جاری کیا جس میں آپ نے نظام اور قانون کی پاسداری کو لازم کیا، امیر وغریب اور بوڑھے اور نوجوان کو قانون کی نظر میں برابر کیا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ خیراتی ادارے اُن کے برحق مالکان کی طرف لوٹیں، مال اس راہ میں خرچ ہو جس کو اُس کے ہدیہ کرنے والے نے مختص کیا ہو، ریاست کے تمام معاملات حکومت (Sublime Porte) کی طرف لوٹیں تا کہ وہ قرردادوں کو اخذ کریں اور پھر آپ کی خدمت میں پیش کر دیں، جب آپ نے ریاست کے مالی اور ملکیت کے حقوق میں سے کسی چیز کا استحصال نہیں کیا اور آپ چاہتے ہیں کہ بیت المال میں ایک پیسہ حکومت کی رائے کے بغیر ادھر ادھر خرچ نہ ہو، چھوٹے بڑے ملازمین کی ذمہ داریاں مقرر ہوں اور وزراء کو ان کے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے اور یہ سب کچھ آپ کے اپنے رشتہ داروں اور ذاتی ملازمین پر بھی لازم کر لیا جائے، اگر یہ سب کچھ نافذ ہو جائے تو اللہ کے حکم سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو جائیں گے اور ریاست ایسے مقام پر پہنچ جائے گی جیسے عزت مآب چاہتے ہیں۔"

اس خط کو خلیفہ کے پاس بھیجنے سے پہلے اسے حکومت کے سامنے پیش کیا جس سے انہوں نے اتفاق کیا۔ اس پر بھی اتفاق ہوا کہ صدر خود سلطان عبدالعزیز تک یہ خط پہنچائے گا۔ وہ ان سے ملا اور انہیں خط دیا۔ اس خط کو پڑھنے پر عبدالعزیز غضبناک ہو گئے اور اسی وقت مدہت پاشا کو حکومت سے معزول کیا اور سلانیک کا والی بنا کر اس کو دور بھیجنے کا کا حکم جاری کیا۔ لیکن مدہت پاشا وہاں زیادہ دیر نہ رکا اور جلد ہی واپس استنبول آگیا۔ اُس نے حسین عونی پاشا جو ریاست کی پولیس کا سیکرٹری تھا، اس کے ساتھ مل کر عبدالعزیز کو معزول کرنے کا عہد کیا۔ پھر انہوں نے بحریہ کے سربراہ اور شیخ الاسلام سے بھی رابطہ کیا۔ یہ چاروں خلیفہ کو ہٹانے پر متفق ہو گئے۔ انہوں نے اس کام کے لیے ایک تاریخ مقرر کی اور یہ 1876 کے ابتدائی مہینے تھے۔ مقررہ تاریخ سے پچھلی رات کو مدہت پاشا نے روس کے سوا باقی تمام یورپی ممالک کو بے نام یاداشت بھیجی جس میں اس نے کہا کہ اسلامی شریعت کے مطابق سلطان کی سبکدوشی ناگزیر ہو چکی ہے کیونکہ شریعت کے مطابق ریاست کا حاکم مکمل عاقل ذہن کا مالک ہونا چاہیے۔

30 مئی 1876 کی رات کو بحریہ سرکاری محل، ضولمۃ بغجۃ (Dumulah Baghjah) کے مقابل آگئی اور مسلح افواج نے اکٹھے ہو کر محل کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان کو اس کی معزولی کی خبر دی گئی اور شیخ الاسلام کی طرف سے معزولی کا فتویٰ پڑھ کر سنایا گیا۔ اُس کو سرکاری محل سے نکال دیا گیا اور اُسی وقت مراد پنجم (Murad 5th) کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔

اس طرح مدہت پاشا نے خلیفہ کو یورپی ممالک بالخصوص برطانیہ، جرمنی، فرانس ماسوائے روس کے اتفاق سے ہٹا دیا کیونکہ اُس نے ریاستِ اسلامیہ کے لیے اُس آئین کو اختیار کرنے سے انکار کیا تھا جو مغربی جمہوری نظام سے اخذ کیا گیا تھا۔

عبدالعزیز کی معزولی کے بعد مراد پنجم کی مسلمانوں کے خلیفہ کے طور پر تقرری یہ سوچ کر کی گئی تھی کہ وہ مغربی نظاموں پر مبنی آئین کو قائم کرے گا کیونکہ اُس کی پرورش مغربی طرز پر ہوئی تھی اور وہ روشن خیال آدمی تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے آئین کو اختیار اور نافذ کرنے کی امیدیں اس ہی سے وابستہ تھیں۔ لیکن اُس کے خراب ذہنی توازن کی وجہ سے اس کی صحت بہت بگڑ چکی تھی۔ اس کے باوجود مدہت پاشا آئین کے نفاذ کی کوشش کرتا رہا۔ مراد کی بیماری کے دوران بھی وہ اپنے حمایتیوں سے ملتا رہا، یورپ کے قوانین اور نظام کا مطالعہ کر کے اس نے آئین کو مکمل کر لیا تھا۔ تاہم مراد پنجم کا ذہنی توازن سب پر واضح ہو گیا اور اُس کو معزول کرنا ناگزیر ہو گیا۔ اس بنا پر شیخ الاسلام نے 31 اگست 1876 کو اس کی معزولی کا اعلان کیا۔

یکم ستمبر کو اس کا بھائی عبدالحمید تخت نشین ہو کر مسلمانوں کا خلیفہ بن گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مدہت پاشا نے صدارت عظمیٰ (Grand Vazir) کی ذمہ داریاں قبول کر لیں جس کے بعد برطانیہ نے استنبول میں بڑی طاقتوں کے سفیروں کی کانفرنس منعقد کرنے کی دعوت دی تاکہ بلقان (Balkans) میں دیرپا امن کیلئے نئی تجاویز پیش کی جائیں۔ کانفرنس منعقد ہوئی اور خلافتِ عثمانیہ پر نئی اصلاحات کے اجراء کیلئے دباؤ ڈالا گیا جس بناء پر مدہت پاشا داخلی اصلاحات کے نفاذ پر کاربند ہو گیا۔ اس نے ایک کمیٹی بنائی جو 16 سول ملازمین، 10 علماء اور فوج کے بڑے

بڑے افسران پر مشتمل تھی۔ اُس نے اُن کو ریاست کیلئے آئین تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ انتھک کوشش کے بعد کمیٹی ایک ایسا آئین بنانے میں کامیاب ہوگئی جو بیلجئیم کے آئین سے اخذ شدہ تھا۔ 23 دسمبر کو یہ "قانونِ اساس" کے نام سے جاری کیا گیا۔ اس طرح بیلجئیم کا آئین اسلام کے کچھ پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کا آئین بن گیا۔

یہ آئین جن شقوں پر مشتمل تھا ان میں سے ایک یہ تھی کہ ریاست کے تمام افراد کو عثمانی کہہ کر مخاطب کیا گیا اور ان کی شخصی آزادی کو تسلیم کیا گیا تھا۔ بجائے اس کے اسلام ہی صرف ریاست کا آئین ہوتا جیسا کہ اس سے پہلے تھا ، اسلام کو ریاست کا قومی مذہب قرار دیا گیا یعنی ریاست کی عام تعطیلات اور ان سے ملتے جلتے امور اسلام سے ہی طے ہوں گے۔ آئین کے مطابق عوامی نمائندگی کا اظہار دو اسمبلیوں کے ذریعے سے ہو گا، جن میں سے ایک نمائندوں (Deputies) کیلئے ہوگی جو "The Council of Deputies" کہلائے گی اور دوسری سینیٹرز کیلئے جس کو "The Senate" کا نام دیا گیا، اور اسمبلیوں کے ممبران کو پارلیمانی معافی (Parliamentarian Immunity) حاصل ہوگی۔ یعنی ریاست کے قوانین اور شرعی احکامات اُن پر لاگو نہیں ہونگے جب تک یہ معافی ختم نہیں کر دی جاتی۔ دونوں اسمبلیاں ہر سال نومبر میں اکٹھی ہوں گی اور شاہی خطاب سے ان کا آغاز ہونا چاہیے، نیز وہ قوانین جن کو یہ دونوں اسمبلیاں تجویز کریں گی اُس وقت نافذ العمل ہونا چاہیے جب دونوں اسمبلیاں اِس کو منظور کر لیں اور سلطان اُن کی توثیق کر دے۔ دوسرے الفاظ میں قانون سازی یہ دونوں اسمبلیاں ہی کریں گی۔ مزید براں یہ بھی طے کیا گیا کہ بجٹ کا وضع کرنا بھی مجلس نمائندگان (Deputies Council) کے حوالے کیا جائے اور ایک سپریم کورٹ تشکیل دی جائے جو کہ "Senate" کے دس ممبران ، دس سرکاری مشیروں اور اپیل کورٹ (Appeal Court) کے دس مشیروں پر مشتمل ہو۔ نیز تمام ولایات میں نظام لامرکزیت (Decentralization) کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

عبدالحمید کی مدحت پاشا کے آئین کی مخالفت کرنا:

یہ آئین جمہوری نظام پر قیاس کیا گیا تھا جو کفریہ احکامات پر مشتمل تھا اور اسلام سے مخالف تھا۔ جیسا کہ احکامات بذاتِ خود اسلام کے مخالف تھے اور ان کے نفاذ کا مطلب خلافت کے نظام کو جھٹلانا اور یورپی ممالک کی طرح کا ایک جمہوری ملک قائم کرنا تھا جیسا کہ بیلجیم، جس کا آئین اس وقت خلافت کے آئین کی بنیاد تھا۔ اس لئے دربارِ خلافت (Sublime Porte) اور عبدالحمید نے اس کو نافذ نہیں کیا، اس کے ساتھ ہی علماء اور نمایاں مسلم شخصیات نے بھی اس کی مخالفت کی۔ اس بناء پر دربارِ خلافت بھی اس آئین کے نفاذ سے انکار اور بڑے ممالک کے مطالبوں کو مسترد کرنے لگا۔

عبدالحمید نے برطانیہ کی مکاری اور عداوت کو محسوس کر لیا تھا اور اُس نے کچھ سرکاری افسران کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات کو بھی بے نقاب کیا تھا۔ اس بناء پر اُس نے مدہت پاشا کو صدارت عظمیٰ سے برطرف کیا اور عظیم خیانت کا مرتکب سمجھ کر ملک بدر کر دیا۔ مدہت پاشا انگریزوں کے ساتھ ملا ہوا تھا اور وہ مغربی ممالک پر انحصار کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ لیکن بڑے ممالک بالخصوص برطانیہ خلافتِ عثمانیہ سے غافل نہ تھے اس لیے وہ مدہت پاشا کے وضع کردہ آئین کے نفاذ کی کوششیں کرتے رہے۔ بلکہ برطانیہ نے بلقان کے مسئلے کی چھان بین، خلافتِ عثمانیہ اور اس کے داخلی اصلاحات پر بحث کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

13 جون 1878 کو بڑے بڑے ممالک جیسے برطانیہ، فرانس، روس اور جرمنی پر مشتمل برلن کانفرنس منعقد ہوئی۔ برطانیہ کی نمائندگی اُس وقت کے اُن کے وزیر اعظم ڈزرائیلی (Disraeli) نے کی جو یہودی تھا۔ جرمنی کا نمائندہ بسمارک تھا جو پوری کانفرنس میں برطانیہ کے خلاف خلافتِ عثمانیہ کے ساتھ کھڑا رہا۔ اس کانفرنس کے اجلاس چار ہفتے جاری رہے اور آخر میں کچھ قرار دادیں منظور ہوئیں جن میں سے ایک میں خلافتِ عثمانیہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے نظام میں نئی اصلاحات کو شامل کرے۔ عبدالحمید نے ان کی بالکل پرواہ نہیں کی بلکہ اپنی تمام تر توجہ فوج کی تربیت پر مرکوز رکھی۔ اس نے ہر اُس شخص کو کچلنا شروع کیا جو مغربی ممالک پر اعتماد کرنے کا مشورہ یا اسلام کے چھوڑنے

اور مغربی نظام کو اپنانے کا مشورہ دیتا تھا۔ جس بناء پر مغرب کے پیروکاروں نے ملک چھوڑ دیا اور پیرس اور جنیوا وغیرہ میں اپنے مراکز قائم کر لیے۔

عبدالحمید نے مسلمانوں کے درمیان خلافت کے مرکز کو اسلام کے ذریعے سے مضبوط بنانے کی کوشش کی تاکہ اسے یورپی افکار کے مقابلے کے قابل بنایا جائے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور یورپی ممالک بھی کچھ مغربی قوانین تو داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے اگرچہ ریاست میں جمہوری نظام کو داخل کرنے میں وہ بھی عاجز رہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی کوشش جاری رکھی حتی کہ 1908 میں تنظیم "Young Turks" نے سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ انہوں نے 21 جولائی 1908 میں سیلونیکا (Salonika) میں آئین کا اعلان کر دیا اور اُسی مہینے میں انہوں نے استنبول کی طرف پیش قدمی کی اور اُس پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے سلطان عبدالحمید کو آئین کو ماننے اور اپنی مرضی کے وزراء متعین کرنے پر مجبور کر دیا۔

17 نومبر کو عثمانی پارلیمنٹ کا آغاز آسان ہو گیا تھا اور عبدالحمید عارضی طور پر "Young Turks" کے سامنے مجبور ہو گیا لیکن وہ اس آئین کو ختم کر کے اسلامی شریعت کی طرف لوٹنے پر سختی سے کاربند رہا۔

13 اپریل کو نئے حاکموں کے خلاف بغاوت کی چنگاری بھڑک اٹھی۔ فوجیوں نے بغاوت کر کے ان کے افسروں کا محاصرہ کر لیا۔ اور انہوں نے نعرے بلند کیے کہ " Down with Turks, Down with Turks"۔ یہ دین کی طرف سے اس میں نئی جدت پسندی کے خلاف اعلانِ جنگ تھا اور لوگوں کی اکثریت نے اس آئین کے خلاف احتجاج کیا۔

15 اپریل کو سلطان نے توفیق پاشا کو وزیر اعظم (Grand Vazir) بنایا اور اسے یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ شرعی احکامات اور اسلامی شریعت کو بحال کرے گا اور دستور کو ختم کرے گا۔ لیکن سالونیکا (Salonika) میں موجود فوج نے سلطان کے خلاف دوبارہ بغاوت کر دی، حکومت پر قبضہ کر لیا اور حکومت کو معزول کر دیا۔

26 اپریل کو ایک قومی کمیٹی کا اجلاس ہوا اور انہوں نے شیخ الاسلام کے فتوے پر عمل کرتے ہوئے سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے بھائی محمد رشاد (Muhammad Rashad) کو تخت پر بٹھایا گیا اور آئین کو دوبارہ نافذ کر دیا گیا۔ اس وجہ سے خلافتِ عثمانیہ میں حکومت کا نظام بدل گیا اور خلافت کی جگہ پارلیمانی نظام نے لے لی، جس میں خلیفہ کا کردار نام کے سوا کچھ نہ رہا جو ریاست کا سربراہ تھا اور تخت سنبھالے ہوئے تھا۔ پارلیمان اور حکومت معرض وجود میں آ گئی اور تمام قوانین پارلیمنٹ ہی وضع کرنے لگی، جس کے ساتھ ہی حکومت اور قانون سازی میں شرعی احکامات کا کردار ختم ہو گیا۔

یہ سب آئینی قوانین کے اعتبار سے تھا۔ باقی وہ شرعی احکامات جن سے قاضی فیصلہ کرتے تھے تو ان کو بدلنے کا عمل اس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ مغربی قوانین کو اپنانے کیلئے تحریک 1856 سے چل رہی تھی۔ یہ سب مغربی ممالک، بالخصوص برطانیہ اور فرانس، اُن کے ایجنٹوں اور مسلمانوں میں سے اُن کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگوں کے دباؤ پر ہو رہا تھا۔ ریاست نے سلطان عبدالمجید کے دور سے ہی کچھ مغربی قوانین کو اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کو ریاست میں متعارف کر کے نافذ کیا گیا اور قاضی بھی اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ مثال کے طور پر 1275 ہجری (بمطابق 1857 عیسوی) کو ریاست نے عثمانی سزاؤں کا قانون بنایا۔ 1276 ہجری (1858 عیسوی) کو حقوق اور تجارت کا قانون بنایا۔ پھر 1276 ہجری (1870 عیسوی) کو عدالتوں کو دو اقسام میں تقسیم کر دیا گیا: شرعی عدالتیں اور عمومی عدالتیں جن کے لیے نظام بھی وضع کیا گیا۔ پھر 1295 ہجری (1877 عیسوی) کو ان عمومی عدالتوں کو قائم کرنے کیلئے لائحہ عمل بنایا گیا اور پھر 1296 ہجری (1878 عیسوی) کو حقوق اور سزاؤں کے مقدمات کے اصولوں کا قانون وضع کیا گیا اور شیخ الاسلام اور دیگر علماء نے ان قوانین کو اسلام کے مخالف نہ ہونے کی بنیاد پر ان کے حق میں فتوے دیے۔ پھر جب علماء ریاست میں سول لاء (Civil Laws) کو اپنانے کے لیے کوئی جواز نہ ڈھونڈ پائے تو رسالہ (Journal) ترتیب دے کر اُسی کو معاملات کیلئے قانون بنا لیا گیا اور سول لاء ختم کر دیا گیا۔ یہ 1286 ہجری (1876 عیسوی) کی بات ہے۔ اس کو ترتیب دیتے ہوئے فرانس کے پرانے سول لاء (Civil Law) کو

سامنے رکھا گیا تھا۔ یہ قانون اُن کی فقہ کی کتابوں سے اخذ کیا گیا تھا جس کو لیتے ہوئے اس بات کو مدِ نظر رکھا گیا تھا کہ سول لاء(Civil Law)میں کس چیز کو اعمال کے طور پر اختیار کرنا ہے اور کس کو احکامات کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے، اگر ان سے موافقت رکھنے والے کوئی فقہی قول مل جائے۔ حتیٰ کہ وہ بنیاد کہ جس پر فرانسیسی سول لاء قائم ہے یعنی وہ قدرتی میلان جو اُن کے ہاں نص کی روح کہا جاتا ہے، اسے اپنا لیا گیا اور اس کے لئے قانون میں ایک دفعہ بھی رکھی گئی جو کہتی ہے، "معاہدوں کا اصل سبق اُن کے الفاظ اور بیان میں نہیں بلکہ مقصد اور معانی میں ہوتا ہے"۔

مغربی قوانین کو اختیار کرنا

اس طرح شرعی احکامات اور اسلامی فقہ کو چھوڑ کر مغربی قوانین اور مغربی فقہ اپنالی گئی۔ جس بنیاد پر اِن قوانین کو اپنایا گیا تھا وہ سب ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ بعض مغربی قوانین تو بغیر کسی ردوبدل کے اختیار کر لیے گئے تھے، یہ جانے بغیر کے وہ اسلامی فقہ میں موجود بھی ہیں یا نہیں اور نہ ہی اس فکر کو خاطر میں لائے بغیر کہ یہ اسلامی شریعت کے مطابق ہیں یا مخالف، جیسا کے سزاؤں کا نظام جس نے حدود کو ختم کر دیا تھا۔ بعض قوانین کو فقط بطور احکامات کے لیا گیا تھا، اس رعایت کے ساتھ کہ وہ اسلامی فقہ میں موجود ہیں خواہ وہ کسی گمنام مجتہد کی طرف سے ہی کیوں نہ تھے یا کسی ایسے فقیہ کی طرف سے جو مجتہد ہونے کے معیار پر بھی نہیں اترتا تھا۔ یعنی اگر کوئی حکم فقہ کی کتابوں یا علماء کی آراء کے مطابق ہو تو اختیار کر لیا جاتا ورنہ چھوڑ دیا جاتا جیسے "procedure laws" کے ساتھ ہوا۔ کچھ قوانین کو ترتیب، تقسیم اور توعیت میں تقلید کرتے ہوئے بنایا گیا جہاں شرعی احکامات کو ہی قانون کی دفعہ کے طور پر لیا گیا جیسا کہ رسالہ (Journal) جو کہ فرانسیسی سول لاء (Civil Law) کی تقلید میں وضع کیا گیا تھا۔ لہذا شریعت جس کے ذریعہ قاضی فیصلے کرتے تھے اس کی بنیاد اسلامی شریعت کی بجائے مغربی قوانین بن گئے، اگرچہ ان میں سے بعض شرعی احکامات بھی تھے۔

مغربی قوانین متعارف کروانے میں فتاویٰ کا کردار:

جس چیز نے جمہوری نظام کے قوانین کو ریاستِ اسلامیہ کے آئین میں شامل کرنے میں مدد دی اور مغربی قوانین کو ریاستِ خلافت کی عدالتوں میں اسلامی عدالتوں کی حیثیت سے قانون سازی کی بنیاد بنایا، وہ علماء بالخصوص شیخ الاسلام کے فتاویٰ تھے کہ یہ قوانین اسلام کے مخالف نہیں۔ فتاویٰ کہتے تھے کہ جمہوری نظام اسلام کے مخالف نہیں ہے اور اسلام جمہوری دین ہے۔ شیخ الاسلام نے مغربی قوانین لینے اور ان کو مسلمانوں کی عدالتوں میں نافذ کرنے کی ممانعت نہ ہونے کا فتویٰ جاری کیا کہ اسلام ان کو اپنانے سے منع نہیں کرتا۔ اس لیے جمہوری نظام کے اصول ریاستِ

اسلامیہ کا آئین بن گئے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت کے نزدیک نظامِ حکومت خلافت ہی تھا جب تک کہ ریاست کے سر براہ کو خلیفہ پکارا جارہا تھا، حالانکہ اُن پر جو نظام نافذ کیا جارہا تھا وہ اسلام کے احکامات کے مطابق نہ تھا۔ علاوہ ازیں، مغربی قوانین کو ریاستِ اسلامیہ کی عدالتوں میں بھی نافذ کیا جانے لگا اور ان کو اسلامی قوانین سمجھا جانے لگا۔ ریاست کو بھی اسلامی ریاست ہی سمجھا گیا کہ وہ اسلام کو نافذ کیے ہوئے ہے اگرچہ اس کے نافذ کردہ قوانین حقیقت میں مغربی قوانین تھے، جب تک اسلام میں ان کی اجازت موجود تھی۔ نظامِ حکومت میں جمہوریت کو شامل کرنے اور عدالتوں میں مغربی قوانین کو نافذ کرنے سے ریاست کی اسلامی ساکھ پر کوئی اثر نہیں پڑا، نہ ہی مسلمانوں کی اکثریت اس کو اسلامی ریاست کے احکامات میں تبدیلی سمجھتی تھی کیونکہ ان کے نزدیک اسلام ان قوانین کو اختیار کرنے سے منع نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے نفاذ نے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کی۔ حتیٰ کہ بعض نے اسے ریاست میں اصطلاحات کا آغاز سمجھا۔ کسی نے بھی ان قوانین اور ان احکامات کو کفریہ قوانین اور احکامات کے طور پر نہ دیکھا، بلکہ اس پر راضی ہو گئے اور خاموشی اختیار کرلی۔ اگر کوئی ایسا تھا جو ان قوانین اور احکامات کو قبول نہیں کرتا تھا تو اُس نے بھی چُپ سادھ لی، نہ ہی خلیفہ سے تعارض کیا اور نہ ہی اُسے ان سے باز رہنے کا مطالبہ کیا۔ اگر کسی نے حدود کو ختم کرنے کو ناپسند کیا تو اس نے بھی خلیفہ کے خلاف حدود معطل کرنے پر آواز نہ اٹھائی اور نہ ہی اس سے حدود کی طرف رجوع کرنے کا مطالبہ کیا۔

جمہوری احکامات اور مغربی قوانین کو اختیار کرنے کا فتویٰ جو شیخ الاسلام اور بعض دوسرے علماء نے دیا تھا، اس کی تین وجوہات تھیں۔

پہلی وجہ: وہ نکتہ جو اُس وقت کے اذہان سے لے کر آج تک جڑ پکڑ چکا ہے کہ جو چیز اسلام کے مخالف نہ ہو اور اُس سے منع کرنے کی کوئی شرعی نص بھی موجود نہ ہو تو اس کو لینا جائز ہے۔ اس پر وہ استدلال کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جاہلیت کے معاہدوں کو لوگوں میں رائج دیکھا تو اس پر خاموش ہو گئے اور جس پر خاموش نہیں ہوئے، اس سے منع کر

دیا۔ لہذا جن پر خاموش ہو گئے وہ صحیح ہیں اور جس پر نہی آگئی وہ حرام ہو گئے۔ اسی طرح ہر فکر، حکم اور قانون جو اسلام کے مخالف نہ ہو اور اس کی نہی بھی وارد نہ ہوئی ہو تو اس کو لینا جائز ہے۔

دوسری وجہ: مباح وہ ہوتا ہے جس کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہ ہو۔ لہذا کسی چیز کی تنبیہ کی عدم موجودگی اس چیز کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ لہذا اس چیز کا اختیار کر لینا جس پر نہی وارد نہیں ہوئی ہو مباح ہو جائے گا۔ نیز شریعت اس پر خاموش ہو اور اس کا حکم بیان نہ کرے تو جس پر شریعت خاموش ہو وہ مباح ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **«إن الله فرض فرائض فلا تضيعوها، ونهى عن أشياء فلا تَنْتَهِكوها، وحَدَّ حُدوداً فلا تَعْتَدوها، وعَفَا عن أشياء رحمةً بكم لا عن نسيان فلا تبحثوا عنها»** "اللہ تعالیٰ نے فرائض مقرر کر دیئے ہیں بس ان کو ضائع نہ کرو، کئی چیزوں سے منع کیا تو ان کی خلاف ورزی نہ کرنا، حدیں معین کر دیں تو ان سے تجاوز نہ کرنا اور تم پر شفقت کرتے ہوئے نہ کہ بھول سے بہت سی چیزوں سے در گزر کیا ہے تو اس کے متعلق بحث نہ کرنا"۔ ایک اور روایت میں ہے: **«وما سكت عنه فهو عفو»** "جس پر وہ خاموش ہو تو وہ معاف ہے"۔ لہذا کوئی بھی عمل جس پر شارع خاموش ہے تو وہ مباح ہے۔ یعنی ایسے احکامات اور قوانین جس کا شریعت میں حوالہ نہیں ہے اور جس کی ممانعت کا شریعت میں ذکر نہیں ہے وہ مباح ہیں۔ اس کی وجہ ان کے متعلق تنبیہ کا نہ ہونا اور اُن کی ممانعت کا نہ پایا جانا ہے، نیز شریعت میں ان کا تذکرہ موجود نہ ہونا ہے کیونکہ اس پر شریعت نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

تیسری وجہ: جو اس وقت مشہور ہوا اور آج ہر طرف پھیل چکا ہے کہ جمہوریت اسلام میں سے ہے کیونکہ اُس کی بنیاد شوریٰ، انصاف اور مساوات ہے۔ اختیار اُمت کے پاس ہونا اس کی بھی بنیاد ہے اور اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ اسلام مالدار اور فقیر، فرائض واجبات، وزیر اور چرواہے کے درمیان برابری قائم کرتا ہے، ان کے معاملات کو ان کے درمیان باہمی مشورہ سے طے کرتا ہے اور معاملات کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بناتا ہے۔ اسلام کے اسی شوریٰ کے نظریے کو آج جدید شکل میں یورپ والے پارلیمنٹ کہتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نئی شکل جدید دور میں

صحافت کو تنقید کی آزادی اور افراد اور جماعتوں کو ملنے والی رائے کی آزادی نے لے لی ہے۔ ہر چیز کی توثیق اور نفی وہ خود اُس کو جانچنے کے بعد کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کے مطابق بولتے ہیں۔ کوئی بھی شخص احتساب سے بالاتر نہیں ہے ،نہ حکومت اور نہ ہی والی۔ بلکہ ان کو رائے عامہ کی آگاہی اور تنقید کی آزادی ہی ڈراتی ہے، سیدھا رکھتی ہے اور صحیح کاموں پر مجبور کرتی ہے، جس کو قرآن نے "التواصی بالحق" کا نام دیا ہے۔ اس لیے جمہوریت اسلام سے ہے اور یہ قرآن میں ثابت ہے اور نبی ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔

فتاویٰ کی غلطی:

ان تمام دلائل کی بناء پر جمہوری آئین اور مغربی قوانین اختیار کرنے کے فتاویٰ دیے گئے۔ جبکہ ریاست کو اب بھی اسلامی ریاست ہی تصور کیا جارہا تھا جو کہ نظامِ خلافت کے تحت کام کر رہی تھی۔ اس کی قانون سازی کو اسلام کے مطابق اور اس کے اخذ کردہ قوانین کو اسلامی قوانین سمجھا جارہا تھا۔

یہاں سے نقائص اور انحراف شروع ہوا، کیونکہ ان تین امور سے متعلق افکار میں اسلام کو سمجھنے میں ہی بنیادی غلطی ہوئی۔ ان کے مندرجہ ذیل پہلو تھے:

پہلا پہلو: وہ افکار جن کا تعلق عقیدہ سے ہے یعنی عقائد اور شرعی احکامات، اور وہ افکار جو سائنس، فنون، صنعتوں یا ان کے مثل سے متعلق ہیں، ان دونوں میں فرق ہے۔ وہ افکار جو علوم، فنون اور اس کے مثل سے متعلق ہیں اگر وہ اسلام کے مخالف نہ ہوں تو ان کا لینا جائز ہے۔ باقی وہ افکار جو عقیدہ اور شرعی احکامات سے متعلق ہیں، اُن میں سے کسی ایک کو بھی اختیار کرنا حرام ہے ماسوائے اُن کے جو رسول اللہ ﷺ ہم تک لے کر آئے ہیں، چاہے وہ قرآن سے ہو یا سنت سے یا جن کی طرف قرآن وسنت نے رہنمائی کی ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے جو کہ مسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**إنما أنا بشر مثلكم، إذا أمرتُكم بشيءٍ من أمر دينكم فخذوا به، وإذا أمرتكم بشيء من أُمور دنياكم فإنما أنا بشر**» "میں بھی تمہاری طرح کا بشر ہوں، تو اگر میں تمہارے دین کے متعلق کسی چیز کا حکم دوں تو اس کو لے لو، اور اگر میں تمہاری دنیاوی امور کے متعلق کسی چیز کا حکم دوں تو میں بھی بشر

ہوں"۔ اس کی دلیل اس حدیث میں بھی ہے جہاں کھجوروں کی افزائش کے واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«أنتم أدرى بأمور دنياكم»** "تم اپنی دنیاوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو"۔ لہٰذا جو شریعت کا حصہ نہ ہو، یعنی عقائد اور احکامات کا حصہ نہ ہو، تو اس کو لینا جائز ہے جب تک کہ اسلام کے مخالف نہ ہو۔ تاہم وہ جو شریعت کا حصہ ہوں، یعنی عقائد اور احکامات سے متعلق ہوں تو اس میں وہی قابل قبول ہے جو رسول اللہ ﷺ لائے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ جمہوری قوانین اور احکامات وہ احکامات ہیں جو انسان کی مشکلات کے حل کیلئے لیے جاتے ہیں تو یہ قانون سازی کا حصہ ہیں۔ لہذا انھیں لینا درست نہیں ہوگا ماسوائے یہ کہ انھیں رسول اللہ ﷺ ہی لائے ہوں، یعنی انھیں اختیار کرنا درست نہیں ماسوائے یہ کہ وہ شرعی احکامات ہی ہوں۔

دوسرا پہلو: رسول اللہ ﷺ نے ہر عمل سے صریحاً منع فرمایا سوائے ان کے جو آپ ﷺ لے کر آئے۔ مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا سے ایک روایت نقل کی گئی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«ومن أَحْدَثَ في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رَدٌّ»** "جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کرلی جو کہ اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے"۔ ایک دوسری روایت میں ہے:

«من عمل عملاً ليس عليه أمرنا فهو رَدٌّ» "اگر کسی نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا کوئی حکم نہیں تو وہ مردود ہے"۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **«لا تقوم الساعة حتى تأخذ أمتي بأَخْذِ القرون قبلها شِبْراً بشبْر وذراعاً بذراع، فقيلَ: يا رسول الله، كفارس والروم؟ فقال: ومَنْ مِنَ الناس إلا أولئك؟!»** "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک میری اُمت اپنے سے پہلی قوموں کی تابعداری ایسے نہ کریں، یعنی بالشت در بالشت اور ہاتھ در ہاتھ"، تو کہا گیا، "اے اللہ کے رسول ﷺ کیا فارس اور روم والوں کی؟"، تو فرمایا، "اُن کے علاوہ اور کون ؟"۔ بخاری نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **«لتتَّبِعُنَّ سَنَن من كان قبلكم شبراً بشبر وذِراهاً بذراع حتى لو دخلوا جُحْر ضَبٍّ تَبِعْتُموهم، قلت يا رسول الله اليهود والنصارى: قال: فمن؟!»** "تم نہ صرف اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں کی اتباع کروگے

بالشت در بالشت اور ہاتھ در ہاتھ، حتیٰ کہ اگروہ گوہ کی بل میں داخل ہوں تو تم اُس میں بھی ان کی پیروی کروگے"، میں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! کیا وہ یہود و نصاریٰ ہیں؟"، فرمایا: "اور کون؟"۔ یہ احادیث واضح طور پر دوسروں سے کچھ بھی لینے سے منع کر رہی ہیں پہلی حدیث، «**فهو رَدّ**» "وہ مردود ہے"، کے الفاظ کی وجہ سے اپنی دونوں روایتوں کے ساتھ نہی اور لینے کی مذمت میں بالکل صریح ہے۔ آخری دو احادیث بھی نہی کے معنی پر دلالت کرتی ہیں۔ اسلام سے ہٹ کر آئینی احکامات اور قوانین لینے پر یہ نہی لاگو ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ کسی ایسی نئی بات کو ایجاد کرنا ہے جو ہمارے نظام میں اجنبی ہے، چاہے وہ کسی دوسرے نظام سے ہی کیوں نہ ہو۔ فارسیوں اور رومیوں کی مثل انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مثل کی سی ہے اور یہ اُن کی اتباع میں آتا ہے، اس لیے ان احکامات اور قوانین کا لینا حرام ہے۔

تیسرا پہلو: نبی ﷺ رسول ہونے کے باوجود جب ان سے کسی ایسے حکم کے بارے میں سوال کیا جاتا جس کے بارے میں ابھی وحی نازل نہ ہوئی ہوتی تو آپ ﷺ جواب نہ دیتے اور انتظار کرتے حتی کہ اللہ تعالی کوئی حکم نازل کرتے۔ بخاری نے ابن مسعودؓ سے ایک روایت نقل کی ہے: «**سئل النبي ﷺ عن الروح فسكت حتى نزلت الآية**» "رسول اللہ ﷺ سے روح کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ خاموش ہو گئے یہاں تک کہ آیت نازل ہوئی"۔ امام بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے بھی روایت کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: «**مرضت فجاءني رسول الله ﷺ يعودني وأبو بكر وهما ماشيان، فأتاني وقد أُغميَ علي، فتوضأ رسول الله ﷺ ثم صَبَّ وَضوءه عليَّ فأَفَقْت فقلت: يا رسول الله، وربما قال سفيان، فقلت: أي رسول الله، كيف أقضي في مالي؟ كيف أَصنع في مالي؟ فما أجابني بشيء حتى نزلت آية الميراث**» "میں بیمار ہوا تو حضور ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ میری تیمارداری کیلئے پیدل آئے اور میں اس وقت بے ہوش تھا۔ حضور ﷺ نے وضو کیا پھر اپنے وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا تو میں ہوش میں آگیا میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اپنے مال کے متعلق کیسا فیصلہ کروں؟ میں اپنے مال کا کیا کروں؟ تو حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ وراثت کی آیت نازل ہوئی"۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وحی کے علاوہ سے لینا جائز

نہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے وحی کے آجانے تک کوئی رائے بیان نہیں کی تو یہ دلیل ہے کہ وحی سے ثابت شدہ کے علاوہ کو لینا جائز نہیں ہے۔

چوتھا پہلو: بیشک اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم ان چیزوں کو لیں جن کا حکم رسول اللہ ﷺ دیں اور ان سے رک جائیں کہ جس سے وہ منع کریں اور یہ بھی حکم دیا کہ ہم فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر جائیں، یعنی اُس طرف جو کچھ رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**وما آتاكم الرسولُ فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا**﴾ "جو کچھ رسول ﷺ نے تمہیں دیا ہے تو اس کو لے لو اور جس سے تمہیں منع کیا تو اُس سے رک جاؤ"۔ (الحشر۔7)۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز رسول اللہ ﷺ لے کر نہیں آئے وہ ہمیں وہ نہیں لینی چاہیے۔ جہاں تک ﴿**ما نهاكم عنه**﴾ ،"جس سے تمہیں منع کیا" کے مفہوم مخالفہ کا تعلق ہے تو یہ دیگر نصوص کے عمومی ہونے کے باعث قابلِ عمل نہیں ہوگا اور رد ہوگا کیونکہ وہ نصوص اسلامی شریعت سے ہٹ کر کسی بھی چیز کو لینے سے منع کر رہی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿**فلا وَرَبِّكَ لا يؤمنون حتى يُحَكِّموك فيما شَجَرَ بينهم**﴾ "قسم ہے تیرے رب کی، یہ اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے درمیان کے جھگڑوں میں آپ ﷺ کو ثالث نہ بنالیں"۔ (النساء۔65)۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أُمِروا أن يكفروا به**﴾ "وہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنا فیصلہ طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں"۔ (النساء۔60)۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: «**كل عمل ليس عليه أمرنا فهو رَدٌّ**» "ہر وہ عمل جس پر ہمارا کوئی حکم نہ ہو تو وہ رد ہوا"۔ ہر مخالف مفہوم کے ساتھ یہی برتاؤ ہونا چاہیے۔ اگر شرعی نص نشاندہی کے لیے موجود تھا اور اُس کے باوجود ہم نے کچھ اور اخذ کر لیا ہو تو وہ مفہوم باطل شمار ہوگا اور قابلِ عمل نہیں ہوگا۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿**ولا تُكْرِهوا فَتَياتِكم على البِغاء إنْ أَرَدْنَ تَحَصُّناً**﴾ "اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ پاکدامن بننا چاہتی ہوں"۔ (النور۔33)۔۔ اس کے مخالف مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ پاکدامنی نہ چاہتی ہوں تو ان کو مجبور کرنا جائز ہے۔ حالانکہ یہ مفہوم اس نص کے عمومی

ہونے کے باعث رد ہوگا جو زنا سے منع کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**ولا تقربوا الزنی**﴾ "زنا کے قریب نہ جاؤ"۔(بنی اسرائیل۔32)۔ اس بنا پر آیت کی پیروی ایسے ہوگی کہ وہ کام کرنا ہے جس کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اور اس سے رکنا ہے جس سے منع کیا ہو۔ لہذا نہ صرف اس کو جائز سمجھنا ضروری ہے جسے اللہ نے جائز کیا ہے بلکہ ہر اُس چیز سے رکنا بھی ضروری ہے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ جو چیز اللہ کے رسول ﷺ ہم تک لے کر نہیں آئے ہمیں اسے نہیں لیتے اور جس سے انہوں نے منع نہیں کیا ہم اُس سے نہیں رکتے۔ تاہم ممانعت کی عدم موجودگی کا مطلب یہ نہیں کہ اُس کو اختیار کرنا جائز ہے، کیونکہ شریعت کے علاوہ کہیں سے بھی کچھ لینے سے منع کیا گیا ہے، یعنی کہ ممانعت کے نہ ہونے کا مطلب ہے کہ اللہ نے اس سے منع نہیں کیا۔ یہی آیت کا مفہوم ہے۔ اگر اس آیت کو اللہ کے اس فرمان سے جوڑا جائے: ﴿**فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة أو يُصيبَهُمْ عذاب أليم**﴾ "اور جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں اُن کو اُس سے ڈرنا چاہیے کہ اُن پر کوئی آفت نہ آپڑے یا اُن پر کوئی دردناک عذاب نہ نازل ہو جائے"۔(النور۔63)۔ اور یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿**وما آتاكم**﴾ یعنی "جو کچھ تم تک وہ لے کر آئے ہیں"، اور ﴿**وما نهاكم**﴾ یعنی "اور جس چیز سے تمہیں منع کیا ہے" میں لفظ ﴿**ما**﴾ یعنی "جو کچھ"، عمومیت کی اصطلاح ہے تو اِس اعتبار سے اُن کے لائے ہوئے کو اختیار کرنے کی فرضیت نمایاں ہو گئی اور اسی طرح اُن کے لائے ہوئے سے ہٹ کر کسی چیز کو اختیار کرنے کی ممانعت پر گناہ ہوگا جس پر سخت سزا ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**فلا وربِّكَ لا يؤمنونَ حتى يُحَكِّموك فيما شَجَرَ بينهم**﴾ "پھر قسم ہے آپ کے رب کی، یہ لوگ مومن نہ ہونگے جب تک یہ آپس کے جھگڑوں میں آپ ﷺ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں"۔(النساء۔65)۔ لہٰذا اللہ نے اُن لوگوں کے ایمان کو رد کر دیا جو اپنے اعمال میں رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور کو حوالہ بناتے ہیں، جو حتمی طور پر دلالت کرتا ہے کہ فیصلوں میں حوالہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ قرآن نے ان لوگوں کی ہلاکت کی خبر دی جو کہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے طریقوں کے علاوہ سے فیصلہ کروانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**ألم ترَ إلى الذين**

يزعمون أنهم آمنوا بما أُنزل إليكَ وما أُنزل من قبلكَ يُريدونَ أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أُمروا أن يكفروا به ويُريدُ الشيطان أن يُضلّهم ضلالاً بعيداً﴾ "کیا آپ ﷺ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے جو آپ ﷺ پر نازل کیا گیا اور جو آپ ﷺ سے پہلے نازل کیا گیا، وہ چاہتے ہیں کہ اپنا فیصلہ طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں اور شیطان ان کو گمراہ کرنا چاہتا ہے"۔(النساء۔60)۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے طریقوں کے علاوہ سے فیصلہ کرنا گمراہی ہے کیونکہ یہ طاغوت سے فیصلہ کروانا ہے۔

پانچواں پہلو: حکم شرعی بندوں کے افعال سے متعلق شارع کا پیغام ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے افعال میں شارع کے پیغام کو بنیاد بنائیں اور اپنے معاملات اس پیغام کے مطابق چلائیں۔ اگر انہوں نے کوئی ایسا عمل اختیار کیا جو کہ شارع کے خطاب سے متصادم نہیں تب بھی وہ شریعت سے ہٹ کر عمل کرنے والے ہونگے، کیونکہ انہوں نے شریعت کے اصل حکم کو اختیار نہیں کیا بلکہ اس کو لیا جو اُس سے متصادم نہیں، لہٰذا ان کا اس کو اختیار کرنا شرعی حکم کے مطابق نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اگر انہوں نے کوئی ایسا فیصلہ لیا جو شرعی حکم کے تو موافق ہو لیکن قرآن وسنت سے نہ لیا ہو تو یہ لینا بھی حرام ہے کیونکہ اُس نے شرعی حکم کو اختیار نہیں کیا بلکہ شرعی حکم سے ہٹ کر ایک حکم لیا جو شرعی حکم جیسا ہی ہے۔ اس صورت میں اُس کا ماخذ وہ نہیں ہوگا جو رسول اللہ ﷺ ہم تک لے کر آئے ہیں بلکہ اُس سے ہٹ کر ہوگا جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، چاہے وہ بظاہر ملتے جلتے ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ مسلمان کو شریعت سے ہٹ کر حکم نہ لینے کا پابند کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر شرعاً نکاح شرعی ایجاب و قبول کے دو لفظ یعنی انکاح اور تزویج کے ساتھ دو مسلمان گواہوں کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ اگر ایک مسلمان مرد اور عورت گرجا گھر میں چلے جائیں اور پادری نے عیسائیوں کے طریقہ نکاح کے مطابق انکاح اور تزویج کے الفاظ کے ساتھ دو مسلمان گواہوں کی موجودگی میں ان کا نکاح پڑھا دیا تو کیا انہوں نے شرعی حکم کے مطابق نکاح کیا یا اُس سے ہٹ کر؟ یعنی کیا انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے طریقوں کے مطابق فیصلہ کیا یا عیسائیت کے لائے ہوئے مسخ شدہ اور منسوخ طریقہ کے مطابق؟ یا مثال کے طور پر اگر ایک عیسائی مر گیا ہے اور اس کے پسماندگان آپس میں وراثت کو اسلام کے احکام کے مطابق تقسیم کرتے

ہیں کیونکہ اسلام کا طریقہ عادلانہ، شفاف یا مفید ہے اور انہوں نے شرعی عدالت سے وراثت کی دستاویز بھی لے لی تو کیا انہوں نے شرعی حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے یا انہوں نے فقط ایک منصفانہ اور مفید نظام لیا؟ بے شک انہوں نے شرعی حکم نہیں لیا کیونکہ حکم شرعی جب بھی لیا جا رہا ہو تو اس نیت سے ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا طریقہ ہے یعنی اس لیے کہ یہ اللہ کے اوامر و نواہی ہیں، صرف اسی صورت میں اس کو اختیار کرنا شرعی حکم ہو گا۔ لیکن کسی حکم کو اس لیے لینا کہ وہ عادل یا مفید ہے تو حقیقت میں یہ حکم شرعی کا لینا نہ ہو گا۔ آیت یہ کہہ رہی ہے: ﴿حتى يُحَكِّموك﴾ "جب تک آپ کو ثالث نہ بنالیں"۔(النساء۔65)۔اور کہہ رہی ہے: ﴿ما آتاكم الرسولُ فخذوه﴾ "جو کچھ رسول ﷺ دیں وہ لے لو"۔(الحشر۔7)۔ لہٰذا شرعی حکم اس بنیاد پر لیا جانا چاہیے کہ اسے رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔اسی طرح اگر کچھ بھی اس بنیاد سے ہٹ کر لیا جاتا ہے تو وہ شرعی حکم نہیں مانا جائے گا، خواہ حکم شرعی کے موافق ہو یا مخالف ہو، حتیٰ کہ اگر بعینہ وہی لے لیا گیا ہو، اس لیے کہ وہ مفید اور عادل ہے اور اس وجہ سے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا ہے، تو وہ بھی حکم شرعی نہ ہو گا۔

چھٹا پہلو: رسول اللہ ﷺ کا کفر کے معاہدوں کو منظور (قبول) کرنا صرف اُنہی کیلئے خاص ہے کیونکہ انہوں نے ایسا بحیثیت اللہ کے رسول کے طور پر کیا ہے اور اُن کی منظوری بھی قانون (شرعی حکم) کی حیثیت رکھتی ہے جیسے آپ ﷺ کا قول اور فعل رکھتا ہے۔اُن کی یہ خصوصیت اُن کے علاوہ کسی اور شخص کے لیے نہیں ہے۔اس لیے رسول ﷺ نے جو کچھ کیا، کہا یا جس کو اُنہوں نے منظور (قبول) کیا وہ قانون (شرعی حکم) کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بنیاد وحی ہے۔رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ قانون بنائے۔ لہٰذا وہ معاہدے جن پر رسول اللہ ﷺ نے خاموشی اختیار کی، شرعی احکامات بن گئے ،اگرچہ وہ جاہلیت ہی کے دور کے معاہدے تھے۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شرعی احکامات ہیں، چاہے وہ عبادات سے متعلق ہی کیوں نہ ہوں۔اس لیے یہ رسول اللہ ﷺ کی اس اجازت کی بنیاد پر اخذ کیے جائیں گے اور اسی بنیاد پر لیے گئے ،اس اعتبار سے نہیں لیے گئے کہ یہ جاہلیت کے معاہدے ہیں جو اسلام سے ٹکراتے نہیں۔ صحابہؓ کسی حکم پر رسول اللہ ﷺ کی خاموشی سے یہ

استدلال کرتے تھے کہ وہ شرعی حکم ہے۔ پس روایت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے دستر خوان پر گوہ کھایا گیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے نہیں کھایا، تو ابنِ عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خاموشی سے گوہ کے کھانے کو مباح ہونے پر استدلال کیا، باوجود یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے خود نہیں کھایا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے واقعات ہیں کہ جن میں رسول اللہ ﷺ کا سکوت اس پر دلیل تھا کہ یہ بھی شرعی احکام میں سے ہیں۔

ساتواں پہلو: مباح وہ نہیں ہے کہ جس کے کرنے میں حرج نہیں کیونکہ کسی کام کے کرنے یا رکنے میں حرج کی عدم موجودگی شرعی اجازت کی نشاندہی نہیں کرتا، نہ ہی حرج کے ہٹ جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ اس میں اختیار کی آزادی ہے۔ کسی چیز سے روکنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے مخالف کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح کسی پر اختیار دینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اُس کے مخالف سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ حرج کا نہ ہونا فرائض کے ساتھ دوگنا بھی کیا جا سکتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**فمن حجَّ البيتَ أو اعتمَر فلا جُناحَ عليه أن يَطَّوف بهما**﴾ "پس جس نے بیت اللہ کا حج اور عمرہ کیا تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ طواف کرے"۔ (البقرة۔158)۔ لہذا حج اور عمرہ میں طواف واجب ہے مباح نہیں۔ کبھی حرج کا ہٹ جانا رخصت ہو سکتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**فليسَ عليكُم جُناحٌ أن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلاة**﴾ "تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرو"۔ (النساء۔101)۔ لہٰذا رفع حرج کا معنی اجازت نہیں۔ اسی بنیاد پر مباح وہ نہیں ہے جس میں حرج نہ ہو، بلکہ مباح وہ ہے جس پر شارع کی طرف سمعی دلائل اس طرف اشارہ کرتے ہوں کہ عمل کو انجام دینے یا ترک کرنے کا اختیار بغیر کسی متبادل کے ہے۔ لہٰذا مباح وہ عمل ہے جس کے کرنے یا رکنے پر شریعت نے اختیار دیا ہو، بے شک وہ اجازت بذاتِ خود آیت میں صراحتاً موجود ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**نساؤكم حَرْثٌ لكم فأْتُوا حَرْثَكم أَنَّى شِئْتُم**﴾ "تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیت کی مانند ہیں پس تم آؤ اپنے کھیت میں جس طریقے سے چاہو"۔ (البقرة۔223)۔ اور جیسے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿**وكُلا منها رَغَدَاً حيثُ شِئْتُما**﴾ "اس میں سے جتنا چاہو جہاں سے چاہو کھاؤ"۔ (البقرة۔35)۔ یا نص میں سے استنباط کے ذریعے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**وإذا حَلَلْتُم**

فاصطادوا﴾ "جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو"۔(المائدۃ۔2)۔ اور جیسے ارشاد ہے: ﴿فإذا قُضِيَت الصلاةُ فانتشروا﴾ "پس جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ"۔(الجمعہ۔10)۔ اور جیسے ارشاد ہے: ﴿كُلُوا من طَيِّبات ما رزقناكم﴾ "کھاؤ اُن پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دیں"۔(البقرۃ۔57)۔

اس کے علاوہ, اباحت شرعی احکامات کا حصہ ہے اور شرعی حکم شارع کا خطاب ہے جو بندوں کے افعال سے متعلق ہے، لہٰذا کسی چیز پر یہ دلالت کرنے کیلئے کہ یہ مباح ہے، سمعی دلائل میں سے کسی شرعی دلیل کا اُس چیز کو مباح ٹھہرانا ضروری ہے۔ لہٰذا کسی چیز پر شرعی دلیل کا وارد نہ ہونا کہ وہ واجب، مندوب، حرام یا مکروہ ہے، یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ مباح ہے کیونکہ اس کیلئے بھی کسی شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے جو کہ اس کی اباحت پر دلالت کرے۔

باقی وہ افعال اور اشیاء جو شریعت کے آنے سے پہلے کی تھیں جیسے معاہدے یا لین دین، ان کی اباحت یہ نہیں تھی کہ یہ شریعت کے آنے سے پہلے ایسے ہی تھے بلکہ شرعی نص ہے جو اس کی نشاندہی کرتی ہے۔ تجارت پر شرعی نص وارد ہوئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وأحل الله البيعَ وحَرَّمَ الربا﴾ "اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے"۔(البقرۃ۔275)۔

اُجرت پر لینے کا کام رسول اللہ ﷺ نے کیا۔ ایک روایت کہ مطابق آپ ﷺ نے بنی الدیل کے ایک آدمی کو اجرت پر لیا تاکہ وہ راستہ دکھانے میں رہنمائی کرے۔ تو تجارت اور اجرت کی اباحت شرعی نص کی وجہ سے ہے نہ کہ ایام جاہلیت کا تسلسل۔ شرعی دلیل کا تعین جس طرح قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے قول سے ہوتا ہے اس طرح اُس فعل سے بھی ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا ہو یا اُس پر سکوت اختیار کیا ہو۔ تو ایام جاہلیت سے وہ افعال و اشیاء، معاہدے اور معاملات جو ایامِ اسلام تک چلے آئے ہوں، اس پر مسلمان بھی عمل پیرا ہوں تو ان کا عمل پیرا ہونا شرعی دلیل کے آنے کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس کی اباحت پر دلالت کرتی ہو، یا تو وہ قرآن یا رسول اللہ ﷺ کے قول سے ثابت ہو یا رسول اللہ ﷺ کے فعل سے یا پھر سکوت سے ثابت ہو، نہ کہ صرف اُس کا تسلسل ہو جو جاہلیت میں پایا

جاتا تھا۔اس کے برعکس جو چیز ایامِ جاہلیت میں ہو اور اس پر کوئی قولی، فعلی یا سکوتی دلیل شرعی نہ ہو تو اس پر نہ دوام کیا جائے گا اور نہ ہی لیا جائے گا اگرچہ اس پر نہی نہ بھی آئی ہو۔ بلکہ اس پر کوئی شرعی دلیل ڈھونڈنا ضروری ہے۔اسی بنا پر شریعت سے پہلے پائی جانے والے اور اس کے آنے کے بعد بھی جاری رہنے والے معاملات کی اباحت،اُس کے متعلق شرعی دلیل ہونے کی وجہ سے ہے۔

اب یہ کہنا غلط ہو گا کہ کیونکہ شریعت اس پر خاموش ہے تو لہٰذا اس کی اباحت برقرار رہی اور ہر وہ چیز جس پر شریعت خاموش ہو اور اس کے متعلق حکم کو بیان نہ کرے تو وہ مباح ہے۔یہ اس لیے کیونکہ شریعت اس پر خاموش نہیں رہی بلکہ اس سے متعلق دلیل کو اصول کے ذریعہ واضح کر دیا اور اس پر رسول اللہ ﷺ کی خاموشی شریعت کی خاموشی نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ یہ شریعت کی طرف سے بیان ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی خاموشی آپ ﷺ کے قول اور فعل اور قرآن مجید کی طرح ہے جو کہ شارع کا بیان ہے۔

کسی مسلمان کو اس آیت پڑھنے کے بعد حق حاصل نہیں کہ وہ یہ کہے کہ شارع کسی چیز پر خاموش ہے اور اس کے متعلق حکم بیان نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام ديناً**﴾ "آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر لیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور تمہارے لئے بطور دین کے اسلام کو پسند کیا"۔(المائدۃ۔3)۔اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿**ونزلنا عليك الكتاب تبياناً لكل شيء**﴾ "ہم نے تم پر ایسی کتاب اتاری جو کہ ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کرنے والی ہے"۔(النحل۔89)۔ مسلمانوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ یہ کہیں کہ کچھ صورتحال (situations) شریعت سے مستثنیٰ ہیں،یعنی شریعت نے اس صورتحال سے مطلقاً غفلت برتی اور اس کے لئے کوئی دلیل قائم نہیں کی۔اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن وسنت میں اس سے متعلق کوئی دلیل نہیں آئی اور اُن میں کوئی شرعی علت اس طرف نشاندہی نہیں کرتی جو کہ کسی نص میں صراحتاً، دلالتاً، استنباطاً یا قیاساً کے ہی آجاتی کہ اس دلیل اور نشانی سے شریعت ان بعض معاملات کا حکم بیان کرتی کہ آیا وہ واجب ہے، مندوب ہے، حرام ہے، مکروہ ہے یا مباح

ہے۔ تو کسی مسلمان کو یہ رائے نہیں رکھنی چاہیے کیونکہ اس طرح سے وہ شریعت پر بہتان لگا رہا ہو گا کہ شریعت ناقص ہے اور شریعت کے علاوہ سے اپنے فیصلہ کو جائز قرار دے رہا ہو گا اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مخالفت کرے گا: **﴿فلا وَرَبِّكَ لا يؤمنون حتى يُحكّموك فيما شَجَرَ بينهم﴾** "تیرے رب کی قسم یہ اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں آپ ﷺ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنا لیں"(النساء، 65)۔ اگر شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا اور مسلمان کوئی ایسا فیصلہ اختیار کرے جس کو شریعت نے بیان نہیں کیا تو اس نے غیر شرعی حکم اختیار کیا اور یہ جائز نہیں۔ جو کہ اس بات کا اقرار ہے کہ شریعت نے تمام حالات کے بارے میں احکامات نہیں دیے۔ شریعت کے علاوہ سے فیصلہ لینے والے کیلئے یہ دعویٰ باطل ہو گا کہ اُس نے یہ حکم اس لیے اختیار کیا کہ شریعت نے اس کے متعلق احکام بیان نہیں کیے۔ اس بنیاد پر یہ کہنا کہ جس پر شریعت خاموش ہو تو وہ مباح ہے درست نہیں کیونکہ یہ غیر شریعت سے فیصلہ کروانے کو مباح قرار دینا ہے، مزید برآں یہ شریعت پر بہتان ہو گا کہ شریعت بعض احکامات پر خاموش ہے اور اُن کے بارے میں کوئی حکم بیان نہیں کیا۔ حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ شریعت کسی بھی چیز پر خاموش نہیں ہے۔

باقی جو رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، **«إن الله فرض فرائض فلا تضيعوها»** "اللہ نے فرائض مقرر کر دیئے تو اس کو ضائع نہ کرو"۔ یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے جس کو شریعت نے نص کی صورت میں بیان نہیں کیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول کی طرح ہے: **«إن أعظم المسلمين جُرماً من سأل عن شيء لم يحرم عليهم فحرم عليهم من أجل مسألته»** "مسلمانوں میں سے سب بڑا جرم کے لحاظ سے وہ ہے جو کسی ایسے مسئلے کے بارے میں پوچھے جو حرام نہ ہو پھر وہ مسئلہ اس کے پوچھنے کی وجہ سے حرام ہو جائے"۔ اس سلسلہ میں بہت ساری احادیث وارد ہوئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **«ذروني ما تركتكم فإنما هلك من كان قبلكم بكثرة السؤال واختلافهم على أنبيائهم، ما نهيتكم عنه فانتهوا، وما أمرتكم به فأتوا منه ما استطعتم»** "میں نے جن چیزوں کے

بارے میں بیان نہیں کیا، اُس کے لیے مجھے چھوڑ دو، جو تم سے پہلے تھے وہ سوالات کی کثرت اور اپنے انبیاء سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوئے ؛ جس سے میں تمہیں منع کروں تو اس سے رک جاؤ اور جس کا حکم دوں تو اسے حسبِ استطاعت انجام دو"۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ جب آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ **ولله على الناس حِجُّ البيت** ﴾ یعنی "اور اللہ نے لوگوں کو حج کا حکم دیا ہے"، تو ایک آدمی نے کہا، "اے اللہ کے رسول ﷺ ! کیا ہر سال حج کرنا ہے ؟"، تو رسول اللہ ﷺ نے منہ پھر لیا، اس نے پھر کہا، "کیا ہر سال ؟"، تو آپ ﷺ نے بے رخی اختیار کی، اس نے پھر کہا کہ، "یا رسول اللہ ﷺ ! کیا ہر سال ؟"، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « **والذي نفسي بيده لو قلتها لوجبت، ولو وجبت لما قمتم بها، ولو لم تقوموا بها لكفرتم، فذروني ما تركتكم** » "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر میں کہہ دوں تو یہ فرض ہو جائے گا اور اگر فرض ہو گیا تو تم اس کو قائم نہ کر سکو گے اور اگر تم اس کو ادا نہ کرو تو گنہگار ٹھہرو گے، اس لیے جس کا میں نے حکم نہیں دیا اس معاملے میں مجھے چھوڑ دو"۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے اس قول « **وعفا عن أشياء** » یعنی "اور اُس (اللہ) نے بہت سی چیزوں کو در گزر کیا"، اور اس روایت « **وما سكت عنه فهو عفو** » یعنی "اور جس پر وہ (اللہ) خاموش رہے تو وہ معاف ہے"، سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے تمارے فرائض میں تخفیف کی ہے پس تم سوال کر کے اپنے آپ پر بوجھ نہ ڈالو۔ جیسے حج کے مسئلے میں کہ وہ ایک سال کیلئے فرض ہوا تو ایک سائل نے پوچھا لیا کہ کیا ہر سال حج کریں ؟۔ اللہ تعالی نے نرمی کی اور تم پر رحمت اور تخفیف کرتے ہوئے عمر بھر میں ایک دفعہ فرض کیا، تو اس سے در گزر کیا کہ ہر سال ہو اور ہر سال فرض کرنے پر خاموش رہے۔ لہٰذا کسی کو بھی اس کے متعلق تحقیق کرنے اور پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اس حقیقت کی دلیل رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے واضح ہے: « **فلا تبحثوا عنها** » "پس اس کے متعلق تحقیق میں مت پڑو"۔ جس سے پہلے آپ ﷺ نے کہا: « **وعفا عن أشياء** » "اور اُس (اللہ) نے بعض اشیاء میں در گزر کیا"۔ جس سے مقصود ان چیزوں میں بحث کرنے سے منع کرنا ہے جن کی حرمت نازل نہیں ہوئی۔ جبکہ یہ مسئلہ یہاں موضوع نہیں کہ اللہ نے کچھ احکام شریعہ بیان ہی نہیں کیے، کیونکہ حدیث کا سیاق و سباق اللہ تعالی کی ان کے ساتھ رحمت اور در گزر کے بیان کیلئے ہے، اور جو دوسری حدیث میں آیا ہے: « **وما سكت**

عنه فهو عفو» "اور اُس (اللہ) نے بعض اشیاء میں خاموش رہ کر در گزر کیا"۔ تو یہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ موضوع یہاں ان چیزوں میں بحث کرنے اور کھوج لگانے سے روکنا ہے جس کو اللہ نے ہم پر آسان کیا ہے اور ہم پر حرام نہیں کیا۔ تو جس چیز کے متعلق منع نہیں کیا گیا تو اُس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی ہے، یعنی جس کی حرمت پر اللہ خاموش ہوئے اللہ تعالیٰ کی در گزر کو ظاہر کرتی ہے تو اس کے متعلق سوال نہ کرو۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿**يا أيها الذين آمنوا لا تسألوا عن أشياءَ إنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُم**﴾ "اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر ہو جائے تو تمہیں اچھی نہ لگے"۔ (المائدۃ۔ 101)۔ پھر فرمایا: ﴿**عفا الله عنها**﴾ یعنی "اللہ نے ان سے در گزر کیا"، یعنی ان امور سے۔

جمہوریت کی اسلام کے ساتھ مخالفت:

آٹھواں پہلو: جمہوریت اپنی بنیاد اور تفصیلات میں کئی اعتبار سے اسلام کے **مکمل مخالف** ہے:

1) جمہوریت حاکمیتِ اعلیٰ عوام کو دیتی ہے اور تمام معاملات کو اُنہی کے سپرد کرتی ہے، لہٰذا ہر چیز میں عوام ہی اعلیٰ ترین معیار ہیں۔ جمہوری نظام کے مطابق عوام ہی طاقت کا سر چشمہ ہوتے ہیں۔ عوام ہی قانون سازی، عدالتی اختیارات، اور انتظامی اختیارات کا منبع ہوتے ہیں۔ لوگ ہی قانون سازی کرتے ہیں، ججوں کو مقرر کرتے ہیں اور حکمرانوں کو تعینات کرتے ہیں۔ اس کے بر خلاف اسلام اقتدار اعلیٰ شریعت کو دیتا ہے نہ کہ عوام کو۔ اس طرح تمام معاملات شریعت کے تابع ہیں اور ہر چیز میں اعلیٰ ترین معیار شریعت ہی ہو گی۔ اختیارات کے اعتبار سے اسلام نے قانون سازی کا اختیار اللہ کیلئے رکھا ہے، لوگوں کیلئے نہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی اکیلے قانون سازی کرتے ہیں خواہ وہ عبادات ہوں، معاملات ہوں، سزائیں ہوں یا اس کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق ہو۔ لوگوں میں سے کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ قانون سازی کریں خواہ وہ کسی ایک حکم سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام میں اتھارٹی عوام کو حاصل ہے، یعنی حکمرانی کا اختیار، لہٰذا وہ ہی حاکم کو چنتے ہیں اور اُس کو اقتدار سونپتے ہیں۔ لہٰذا اسلام میں نظام کے نفاذ کا اختیار صرف عوام ہی کو حاصل ہے یعنی وہ ایک شخص کا انتخاب کریں جو اقتدار کو سنبھالے اور اُن پر احکامات نافذ کرے۔ قاضیوں سے متعلق اختیارات خلیفہ کے

پاس ہوتے ہیں یا جسے خلیفہ تفویض کر دے۔ خلیفہ ہی قاضیوں کو مقرر کرنے کا اختیار رکھتا ہے یا وہ کسی کو نامزد کرتا ہے جو قاضی مقرر کرتا ہے۔ عوام میں سے کسی کو بھی انفرادی یا اجتماعی طور پر کسی قاضی کو مقرر کرنے کا اختیار نہیں، یہ صرف خلیفہ اور اس کے نائب کے ساتھ خاص ہے۔

2) جمہوریت میں قیادت اجتماعی ہوتی ہے نہ کہ انفرادی ہوتی ہے۔ اسی طرح طاقت بھی اجتماعی ہوتی ہے نہ کہ انفرادی۔ اتھارٹی یا اختیارات وزراء کی کمیٹی یعنی کابینہ کے پاس ہوتے ہیں۔ ملک کا سربراہ خواہ وہ بادشاہ ہو یا صدر ایک رسمی سربراہ ہوتا ہے جو حاکم تو ہوتا ہے لیکن اس کا حکم نہیں چلتا۔ فیصلہ کرنے والی اور اختیارات کی مالک کابینہ ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام میں قیادت انفرادی ہوتی ہے اجتماعی نہیں اور اختیارات بھی ایک فرد کے پاس ہوتے ہیں، مجموعی نہیں ہوتے۔ حضرت ابو سعید الحضریؓ سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إذا خرج ثلاثة في سفر فليؤمّروا عليهم أحدهم»** "جب تین آدمی سفر پر نکلیں تو وہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنالیں"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«لا يحل لثلاثة بفلاة من الأرض إلا أمَّروا عليهم أحدهم»** "زمین میں کسی بھی جگہ تین آدمیوں کیلئے جائز نہیں کہ وہ اپنے لیے ایک امیر کے بغیر ہوں"۔ اور "**احد**" کا لفظ تعداد پر دلالت کرتا ہے یعنی ایک سے زیادہ نہیں اور یہ اس کلمہ "**احدهم**" کے مفہوم مخالفہ سے سمجھ میں آرہا ہے۔ یہاں مفہوم مخالفہ پر عمل درآمد ہو گا اور اس کی دلیل منطق کی دلیل کی طرح حجت ہے۔ مگر ایک صورت میں اسے معطل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی اس کو رد کرنے والی نص آجائے۔ یہاں پر ایسی کوئی نص نہیں تو اسی کا اطلاق ہو گا۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ "ایک کو امیر بنائیں" نہ کہ زیادہ کو اور "کسی ایک کو امیر بنائے بغیر"۔ تو ان دونوں احادیث میں مفہوم مخالفہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایک سے زائد کو امیر بنانا جائز نہیں۔ اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کا عمل بھی کرتا ہے کہ جہاں مختلف حالات میں انہوں نے امیر مقرر کیے اور کبھی بھی ایک جگہ پر ایک سے زیادہ امیر مقرر نہیں کیے۔ پس اتھارٹی یا اختیار کا مالک ریاست کا سربراہ یعنی امیر المومنین یا خلیفہ ہوتا ہے

اور ریاست کے تمام اختیارات اسی کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ وہ تن تنہا اتھارٹی اور حکومت کا مالک ہوتا ہے اور کوئی بھی اس چیز میں اس کا شریک نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف اسی کیلئے ہے۔ اسی لیے اسلام میں قیادت اور اتھارٹی انفرادی ہے۔

3) جمہوریت میں ریاست بہت سے اداروں پر مشتمل ہوتی ہے اور وہ ایک ادارہ نہیں ہوتا۔ حکومت ایک ادارہ ہے جو کہ انتظامی اختیارات کا مالک ہوتا ہے جبکہ شعبوں (syndicate) میں سے ہر شعبہ ایک آزاد ادارہ ہے جو کہ اپنے متعلقہ معاملات میں فیصلے کیلئے مکمل طاقت اور اختیار رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر وکیلوں کی انجمن ایک ادارہ ہے جس کا تمام وکیلوں کے معاملات میں اپنا انتظام اور اپنے اختیارات ہیں، وکیلوں کو وکالت کا لائسنس دینا یا لائسنس معطل کرنا؛ ان کے خلاف قانونی کاروائی کرنا اور اس کے علاوہ وہ تمام امور جو وکیلوں کے انتظامات اور اختیارات سے متعلق ہیں۔ ایسے ہی ڈاکٹروں کی انجمن، دواخانوں (Pharamacists) کی انجمن، انجینئروں کی انجمن وغیرہ۔ یہ تمام اپنی اپنی انجمنوں کے متعلقہ معاملات میں پورا پورا اختیار رکھتے ہیں جو اختیار حکومت اپنے متعلقہ امور میں رکھتی ہے۔ بلکہ حکومت بذاتِ خود اتنا اختیار نہیں رکھتی جتنا کہ انجمن (syndicate) اپنے مخصوص معاملات میں رکھتی ہے۔ اس کے بر خلاف اسلام میں ریاست اور انتظامی ادارے ایک جسم کی مانند ہیں جس کے پاس تمام اختیارات ہیں، اور وہ خلیفہ ہے۔ وہ اکیلا ان اختیارات کا مالک ہوتا ہے اور اُس کے علاوہ کوئی بھی یہ اختیارات نہیں رکھتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«الإمامُ راعٍ وهو مسؤولٌ عن رعيته»** "امام نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا"۔ یہاں پر "**هو**" عربی گرامر میں پابندی (restrictive form) کو ظاہر کرتا ہے اور یہ منفصل ضمیر ہے۔ تو آپ ﷺ کا قول "**وهو مسؤولٌ**"، امام کو اس ذمہ داری کا پابند کر رہا ہے۔ اس لیے ملک میں سوائے خلیفہ کے کوئی بھی انفرادی یا اجتماعی حیثیت میں خود اقتدار اور انتظام میں سے کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔

4) جمہوریت میں حکمرانی کے معاملات میں عوام کی رائے کو مد نظر رکھنا لازمی ہے۔ اس لیے حکمران لازمی طور پر عوام یا ان کے منتخب نمائندوں اور اسمبلی کی رائے کا پابند ہے اور اس کو لوگوں سے اختلاف کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ لہذا جمہوری نظام میں لوگوں کی رائے لینا لازمی ہے۔ اس کے بر خلاف اسلام میں عوام کی رائے یعنی مشورہ لینا مندوب ہے

،فرض نہیں۔ یعنی خلیفہ کیلئے امت کی رائے لینا مندوب ہے، فرض نہیں۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مشورہ لینے کی تعریف کی ہے، لیکن اس کو صرف مباحات تک محدود کر دیا ہے۔ تواس کا مباحات میں سے ہونا اور اس کے علاوہ سے نہ ہونا یہ قرینہ ہے کہ رائے لیناواجب نہیں کیونکہ اس کا موضوع مباح ہے۔ تواس میں مشورہ طلب کرناواجب نہ ہوگا۔ یہیں سے خلیفہ کیلئے مستحب قرار دیا گیا کہ وہ عوام کی رائے لے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شوریٰ کی تعریف کی ہے اور کیونکہ یہ مباحات میں ہی ہوسکتی ہے۔

5) جمہوریت میں حکومت کیلئے ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ وہ ہر چیز میں اکثریت کی رائے لے، خواہ وہ قانون سازی سے متعلق ہو یا اس کے علاوہ کسی اور معاملے سے ہو۔ تاہم بعض دفعہ وہ اکثریت کی رائے کو لازمی قرار دیتے ہیں چاہے وہ 51% ہی کیوں نہ ہو اور بعض دفعہ دو تہائی اکثریت کی شرط لگاتے ہیں۔ بہرحال ان کے نزدیک ہر معاملے میں اکثریت کی رائے ضروری ہے۔اس کے برخلاف اسلام میں اکثریت کی رائے کو ہر چیز میں ترجیح نہیں دی جاتی اور نہ ہی اس پر عمل کو ہمیشہ ضروری قرار دیا جاتا ہے۔اس میں تفصیل ہے جو کہ مندرجہ ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

(ا) **شرعی احکامات جو قانون سازی کی آراء ہیں:** اس میں اقلیت یا اکثریت کی رائے کو نہیں دیکھا جاتا ہے بلکہ سب کچھ شرعی دلیل کے تابع ہوتا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے معاملہ میں وحی پر مبنی حکم کو لیا اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی رائے کو ایک طرف کر دیا بلکہ تمام مسلمانوں کی رائے کو ایک طرف کر کے ان کو بالکل نظرانداز کر دیا، ان کے غصہ اور ناگواری کے باوجود اپنی رائے کو اُن پر ضروری قرار دیا۔ ان سے کہا: **«إني عبد الله ورسوله ولن أخالف أمره»** "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں اور اس کے حکم کی مخالفت نہیں کرونگا"۔ تواس سے معلوم ہوا کہ ترجیح اکثریت یا اقلیت کی نہیں بلکہ وحی کی ہے یعنی شرعی دلیل کی ہے۔ بہت سے دلائل موجود ہونے کی صورت میں قوی ترین دلیل کو ترجیح دی جائے گی۔ تو حکم لیتے وقت ترجیح قوی ترین دلیل ہوگی۔ مگر حکم کو اپنانا اور اس کو قانون بنانا صرف خلیفہ کے اختیار میں ہوتا ہے کیونکہ احکامات کو تبنی کرنے کا حق صرف اسی کو ہوتا ہے جس کی دلیل صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے کہ امام کے ذمہ ہے کہ وہ مخصوص احکام کی تبنی کرے اور اس پر عمل

کرنے کا حکم دے۔ مسلمانوں پر اس کی اطاعت کرنا اور اپنی آراء کو چھوڑنا ضروری ہے۔ اور مشہور شرعی قاعدے ہیں:
«أَمرُ الإمام نافذ ظاهراً وباطناً»

"امام کا حکم ظاہراً و باطناً نافذ ہوتا ہے"۔ **«أَمرُ الإمام يرفعُ الخِلاف»** "اما کم کا حکم اختلاف کو ختم کرتا ہے"۔ **«للسلطان أن يُحدث من الأقضية بقدر ما يَحدث من مشكلات»** "حاکم کا حق ہے کہ جس قدر نئی مشکلات پیش آئیں اسی قدر ان کیلئے نئے فیصلے کرے"۔ شرعی احکامات کی طرح شرعی تعریفات بھی ہوتی ہیں جس میں ترجیح دلیل کی مضبوتی ہوتی ہے اور صرف خلیفہ کو ہی اس کی تبنی کا حق ہوتا ہے۔ تو خلیفہ کی رائے ہی کو ترجیح دی جائے گی اور اس کو اپنانا ضروری ہو گا۔

(ب) **وہ رائے جو کسی خاص موضوع میں فکر پر دلالت کرے،** خواہ اُس سے ایک یا متعدد اعمال نکلتے ہوں۔ وہ عمل یا اعمال موضوع کی بنیاد پر جانچے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، اعمال کو اختیار کرنے سے متعلق رائے وہ ہو گی جو موضوع کی سوجھ بوجھ اور گہری فکر طلب کر رہی ہو گی۔ تو یہ رائے اس مضمون میں مخصوص فکر تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس وقت اس پر اس کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم لگایا جاتا ہے یا اس کیفیت کا جس کے ذریعہ سے وہ عمل اپنایا جاتا ہے یعنی جو "رائے، جنگی چال اور حکمتِ عملی" کے قبیل سے ہو۔ یہ رائے جو مضمون میں کسی فکر پر دلالت کرتی ہو اس میں درستگی کو ترجیح دی جاتی ہے، اکثریت کو نہیں۔ مثال کے طور پر:

کیا امت کی نشاۃ ثانیہ کیلئے اس کی فکری بلندی پر کام کرنا چاہیے یا اس کی اقتصادی حالت کو بہتر کرنا چاہیے؟

حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں مرتدوں کی جنگیں کیا شرعی احکامات کو جھٹلانا تھا یا صرف مسلح بغاوت تھی؟

حضرت علیؓ کا خلیفہ بننے کے بعد والیوں کے ساتھ برتاؤ کرنا، کیا انہیں اُن کو برقرار رکھنا چاہیے تھا یا معزول کرنا چاہیے تھا، یا بعض کو برقرار رکھنا چاہیے تھا اور بعض کو معزول کرنا چاہیے تھا؟

جیسے حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف انھوں نے کاروائی کی، کیا انہیں شام کی ولایت سے فوری معزول کرنا چاہیے تھا یا اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے تھا جب تک وہ خلافت کے تمام علاقوں پر اپنا اثر مستحکم نہ کر لیتے؟

جیسے حضری علیؓ کے سامنے قرآن پاک کا اٹھایا جانا، کیا وہ قرآن کو ثالث بنانا تھا یا کہ دھوکہ تھا؟

جیسے دولت عثمانیہ کا استنبول سے بغداد تک ریلوے لائن بچھانے کا ٹھیکہ جرمنی کے ٹھیکیداروں کو دینا چاہیے تھا یا بیلجئیم کے ٹھیکیداروں کو؟

جیسے برطانیہ کا 1962 میں یورپ کی مشترکہ منڈی میں داخل ہونا، تو کیا اسے اس میں داخل ہونا چاہیے تھا یا نہیں؟ یعنی اس کے داخل ہونے سے کیا اس کے لئے اپنے ریاست کی مرکزیت کی حفاظت اور یورپ پر نگرانی باقی رکھنا ممکن ہوتا یا اس کے داخل ہونے سے اس کو اقتصادی اور سیاسی نقصان ہوتا؟

اور جیسے مصر میں مال کی پیداوار آلات کے بنانے یعنی بھاری صنعت کے بنانے سے ہو گی یا ایک بلند ڈیم بنانے سے ہو گی؟

اور جیسے ترکی کا ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہونا، کیا وہ اپنے مال اور بجٹ سے ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہوتا ہے یا خارجی امداد سے مسلح ہوتا ہے؟

خلافتِ عثمانیہ میں نظامِ تعلیم کی بہتری کے لیے مدارس اور کالجوں کی تعداد زیادہ کرنی چاہیے تھی یا تعلیمی نصاب پر نظر ثانی کرنی چاہیے تھی؟

اس طرح ہر وہ عمل جس کا موضوع سوجھ بوجھ اور گہری نظر چاہتا ہے اس میں اکثریت کی بجائے درست نقطہ ء نظر کو ترجیح دینی چاہیے۔اس پر دلیل یہ ہے کہ:

«أن الرسول صلى الله عليه وآله وسلم حين نزل ونزل معه المسلمون عند أدنى ماء من بدر لم يرض الحُباب بن المنذر بهذا المنزل، وكان عليماً بالأمكنة خبيراً بالحرب، فقال للرسول: يا رسول الله، أرأيتَ هذا المنزل أمنزلاً أَنْزَلَكَهُ الله فليس لنا أن نتقدمه ولا نتأخر عنه أم هو الرأي والحرب والمكيدة: قال الرسول: بل هو

الرأي والحرب والمكيدة. فقال: يا رسول الله، إن هذا ليس بمنزل، ثم أشار إلى مكان، فما لبث رسول الله أن قام ومن معه واتبع رأي الحُباب» "بے شک رسول ﷺ اوران کے ساتھ مسلمانوں نے جب بدر کے قریب ترین پانی کے کنویں کے پاس پڑاؤ ڈالا تو حباب بن منذرؓ اس پڑاؤ پر راضی نہ ہوئے کیونکہ وہ جگہوں کے بارے میں جانتے تھے اور جنگی امور کے ماہر تھے، تو انہوں نے رسول ﷺ سے فرمایا اے اللہ کے رسول ﷺ ! مجھے اس جگہ کے متعلق بتایئے کہ کیا یہاں پڑاؤ کیلئے اللہ نے آپ ﷺ کو کہا ہے تو ہمارے لئے ادھر ادھر ہونے کی گنجائش نہیں یا یہ رائے، جنگی چال اور حکمتِ عملی سے متعلق ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ رائے ایک جنگی چال ہے تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ! یہ جگہ مناسب نہیں پھر ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا تو رسول اللہ ﷺ اور جو آپ ﷺ کے ساتھ (فوج) تھے وہ جگہ چھوڑ دی اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت حبابؓ کی رائے کو مان لیا"۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی رائے چھوڑ دیا اور مسلمانوں کی رائے کی طرف بھی رجوع نہیں کیا، بلکہ درست رائے کی پیروی کی اور اس معاملے میں ایک شخص کی رائے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کے متعلق فرمایا: **«بل هو الرأي والحرب والمكيدة»** "یہ رائے، جنگی چال اور حکمتِ عملی ہے"۔ اس رائے کو تمام مسلمانوں پر نافذ کیا کیونکہ یہ درست اور عقلمندانہ رائے تھی۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے ہر رائے جو "رائے، جنگی چال اور حکمتِ عملی" کے قبیل سے ہو اس میں دلیل کی مضبوطی کو ترجیح دی جاتی ہے، اکثریت کو نہیں۔ اور موزوں ترین رائے کے انتخاب کا فیصلہ صرف خلیفہ ہی کرتا ہے اس لئے کہ بدر کے غزوہ میں رسول اللہ ﷺ نے موزوں ترین رائے کا تعین ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے کیا تھا، رسول کی حیثیت سے نہیں۔

اسی طرح کوئی بھی رائے جو بھی کسی خاص موضوع میں ایک فکر پر دلالت کرتی ہو، وہ تکنیکی رائے ہوتی ہے جس کو ماہرین ہی سمجھتے ہیں کیونکہ یہ اس قسم کی ہوتی ہے جس میں سمجھ، گہری نظر اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حبابؓ کی رائے اسٹریٹیجک معاملے میں قبول کی گئی۔ یعنی ایک تکنیکی موضوع میں ایسے شخص کی رائے تھی جو جگہوں کی مہارت اور جنگی حکمتِ عملی کا تجربہ رکھتا تھا۔ اسی کی مثل غیر شرعی تعریفات بھی ہیں اس لئے کہ ان میں بھی سمجھ اور غور فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

(ج) **وہ رائے جو کسی کام کی طرف راہنمائی کرے** اس میں تجربہ کاروں اور فنی ماہرین کی طرف سے سوچ بچار اور گہری نظر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس رائے میں اکثریت کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے اور اس کو لازم قرار دیا جاتا ہے، جیسے خلیفہ کا چناؤ ہے، یعنی فلاں کو منتخب کیا جائے یا فلاں کو؟ اور جیسے کسی واقعہ میں دو آدمیوں سے کسی ایک سے فیصلہ کروانا، یعنی فلاں سے فیصلہ کروائے یا فلاں سے؟ اور جیسے تعمیراتی منصوبہ بنانا، یعنی مدارس بنائے جائیں یا ہسپتال؟ اور جیسے کاشتکاروں امداد دینا کہ کیا نقدی دی جائے یا آلات، بیج اور کھاد کی صورت میں مدد دی جائے؟ اس طرح ہر وہ عمل جس میں تجربہ کاروں اور فنی ماہرین کی طرف سے اس میں سوچ بچار اور گہری نظر کی ضرورت نہ ہو تو اس میں اکثریت کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے اور ریاست کیلئے اس کو لازم قرار دیا جاتا ہے۔ لہذا خلیفہ اس رائے کا پابند ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے موقع پر اکثریت کی رائے کو لیا اور مدینہ سے باہر نکل گئے باوجود یہ کہ آپ ﷺ اس رائے کو غلط اور اس کے بر خلاف رائے کو درست دیکھتے تھے اور بہت سے کبار صحابہ اکثریتی رائے سے مختلف رائے رکھتے تھے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی رائے کو صحیح سمجھتے تھے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کرنی چاہیے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس جیسی صورتحال میں اکثریت کی رائے ہی رائج ہوتی ہے اور اسی کو لینا ضروری ہے۔

بعض لوگوں پر وہ عمل جس کے موضوع میں غور وفکر اور گہری نظر کی ضرورت ہو اور جس عمل میں نہ ہو ،ان دونوں کا فرق واضح نہیں ہو پاتا۔ لیکن اگر دونوں کے دلائل کو باریک بینی سے دیکھا جائے تو فرق واضح ہو جائے گا ۔ غزوہ بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت خبابؓ سے کہا، "بلکہ یہ رائے، جنگی چال اور حکمتِ عملی ہے"، اور آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ کسی بھی جگہ پر پڑاؤ کا تعلق اُن اُمور سے ہے جس میں ماہرین کی آراء سے رجوع کیا جاتا ہے جو کہ جنگی امور کا حصہ ہیں یعنی اُن حالات اور چالوں کا جو کہ دشمن کیلئے چلائی جاتی ہیں، جن میں غور وفکر اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ اُحد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے کہا: **«فإن رأيتم أن تقيموا بالمدينة وتدعوهم حيث نزلوا فإن أقاموا أقاموا بشر مقام وإن هم دخلوها علينا قاتلناهم فيها»** "اگر تم مناسب سمجھ کر مدینہ میں رہو اور ان کو وہیں خیموں میں پڑا رہنے دو، تو اگر وہ وہیں پڑاؤ رکھیں تو بری جگہ پر ٹھہریں گے اور اگر وہ مدینہ میں داخل ہوئے تو ہم ان سے لڑائی کریں گے"۔ تو مسلمانوں میں سے بعض آدمیوں

نے کہا: «**يا رسول الله أخرج بنا إلى أعدائنا لا يرون أنّا جَبنّا وضَعُفْنا**» یعنی "اے اللہ کے رسول ﷺ ہمیں ہمارے دشمن کے پاس باہر لے جائیے، کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم بزدل اور کمزور ہو گئے ہیں"۔ تو عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: «**يا رسول الله، أقم بالمدينة لا تخرج إليهم، فوا لله ما خرجنا منها إلى عدو لنا قط إلا أصاب منا ولا دخلها علينا إلا أصبنا منه، فدعهم يا رسول الله، فإن أقاموا بشر محبس، وإن دخلوا قاتلهم الرجال في وجههم ورماهم النساء والصبيان بالحجارة من فوقهم، وإن رجعوا رجعوا خائبين**» یعنی "اے اللہ کے رسول ﷺ! مدینہ میں ہی رہیں اور ان کی طرف نہ نکلیں، آج تک ہم مدینہ سے باہر نکل کر اپنے کسی دشمن سے نہیں جیتے اور آج تک کوئی مدینے میں داخل ہو کر ہمیں شکست نہیں دے سکا، تو ان کو وہیں رہنے دیں جہاں وہ ہیں، اگر وہ وہیں ٹھہرتے ہیں تو بری طرح پھنسیں گے اور اگر داخل ہوئے تو مرد سامنے سے لڑیں گے اور عورتیں اور بچے اوپر سے ان پر پتھر پھینکیں گے اور اگر وہ واپس بھاگے تو ایسے پست حوصلہ ہو کر بھاگیں گے جیسے داخل ہوئے تھے"۔ تو بحث (مدینہ سے) نکلنے اور نہ نکلنے پر تھی، بحث میدان جنگ کے متعلق نہ تھی یعنی وہ مدینہ میں قلعہ بند ہو کر جنگ کریں یا احد پہاڑ میں قلعہ بند ہوں۔ بلکہ بحث اس آنے والے دشمن کے متعلق تھی کہ کیا اس کا سامنا کرنے کیلئے خود نکلیں اور اس کے ساتھ جنگ کریں یا اپنی جگہ پر ہی رہیں، پھر اگر وہ جنگ کریں تو ہم بھی کریں اور اگر وہ لڑائی نہ کریں تو ان کو چھوڑ دیں۔ اس لئے دونوں واقعوں کی حقیقت میں اور ان دونوں میں رسول اللہ ﷺ کے تصرف میں فرق ہے اور ان دونوں میں اسی فرق کی وجہ سے اس عمل میں فرق واضح ہو جاتا ہے جس میں آپ ﷺ نے ٹھوس رائے کی طرف رجوع کیا اور اس عمل میں جس میں آپ ﷺ نے اکثریت کی رائے کو قبول کیا۔ یعنی اس عمل میں جس کے موضوع میں سوچ بچار اور گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے اور اس عمل میں جس کے موضوع میں سوچ بچار اور گہری نظر کی ضرورت نہیں ہوتی، فرق ہوتا ہے۔ یہ ایک پہلو سے ہے، دوسرے پہلو سے وہ عمل جس کا موضوع نازک ہو اور اہم ہو، اور اس کی سمجھ میں محنت کی ضرورت ہو تو وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے اس عمل سے مختلف ہوتا ہے جس کا موضوع

ہی نہ ہو یا موضوع ہو لیکن نازک نہ ہو یا اکثر لوگ اس کو سمجھتے ہوں۔ دونوں اعمال فرق میں اگرچہ باریک ہے مگر بہرحال موجود ہے اور اس کا ادراک ممکن ہے۔

اسی بناپر اسلام میں اکثریت کی رائے کو صرف ایک صورت میں لیا جاتا ہے، جہاں اعمال میں تجربہ کاروں اور ماہرین کی طرف سے سوچ بچار اور گہری نظر کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے علاوہ جتنے اعمال ہیں ان میں اکثریت کی رائے نہیں لی جاتی۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے نقل کی گئی کہ آپ ﷺ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے فرمایا: **«لو اتفقتما في مشورة ما خالفتكما»** "اگر تم دونوں کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا"۔ تو یہ کثرت رائے کو ترجیح دینے پر دلیل ہے۔ لیکن ان کے اتفاق کو ایک وضاحتی سند کے ساتھ مقید کیا تو فرمایا: **«في مشورة»**، یعنی "مشورہ میں"۔ اس طرح آپ ﷺ کا کہنا: **«ما خالفتكما»**، یعنی "میں تمہاری مخالفت نہ کروں گا"، کو حدیبیہ میں ان دونوں کے اتفاق پر رسول اللہ ﷺ کی مخالفت سے منسلک کیا جائے یا اُن کی رائے پر خباب رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترجیح دینا، تو یہ اس حقیقت کو واضح کر دے گا کہ اُن سے مخالفت نہ کرنے کی شرط جو آپ ﷺ نے بیان کی، وہ **«في مشورة»** "(تمھارے درمیان) مشاورت" ہے۔ یعنی اُن کی مخالفت نہ کرنا دراصل مشورہ سے متعلق امور میں سے ہے جو وحی کے لائے ہوئے کے علاوہ ہو اور رائے، جنگی چال اور حکمتِ عملی کے قبیل سے بھی نہ ہو۔ ہم اس سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اکثریت کی رائے کو تب ترجیح دی جاتی ہے اور اس کو تب لازمی طور پر اختیار کیا جاتا ہے جب وہ شرعی احکامات کے علاوہ میں اور اس کے علاوہ میں یعنی رائے، جنگی چال اور حکمتِ عملی کے قبیل سے نہ ہو۔ اسی وجہ سے اسلام جمہوریت کی مخالفت کرتا ہے۔

6) جمہوریت میں بعض افراد کو استثنیٰ حاصل ہوتا ہے جو ان کو قانون سے بچاتا ہے۔ اس لیے قانون ان کو چھو بھی نہیں سکتا کیونکہ انہیں وہ تحفظ حاصل ہوتا ہے جو انہیں قانون سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور اس کی مثال سربراہ مملکت اور پالیمنٹ کے ممبران کی ہے۔ اگر ملک کے سربراہ نے کوئی جرم کیا تو نہ اس پر مقدمہ چلایا جائے گا اور نہ ہی اس پر قانون

لاگو ہو گا کیونکہ اس کے لیے استثنیٰ ہے۔اسی طرح پارلیمنٹ کے ممبران ہیں کہ اگران میں سے کوئی پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران کسی جرم کا مرتکب ہو تواس پر نہ ہی مقدمہ چلے گااور نہ ہی اس پر قانون لاگو ہوگا جب تک اس کا یہ استثنیٰ ختم نہ ہو جائے۔ یہ اسلام کے خلاف ہے جہاں اسلامی ریاست کے کسی بھی شہری کو کسی قسم کا استثنیٰ حاصل نہیں ہوتا۔ریاست کا سربراہ بھی عام شخص کی طرح ہی ہوتا ہے اگر وہ کسی جرم کاارتکاب کرے تواس پر مقدمہ چلایا جائیگااور اس پر بھی قانون لاگو ہو گا۔یہی سب کچھ مجلسِ شوریٰ کے ممبران پر بھی لاگو ہو گا کیونکہ وہ تمام بھی ایک عام آدمی کی طرح ہیں۔تاہم وہ جرم جس میں وہ مجرم ٹھرایا گیا ہے،اگراس کا تعلق ریاست کی ذمہ داریوں سے نہ ہو یعنی انتظامی یاریاستی احکامات کے علاوہ سے ہو تو پھر عام عدالتوں میں مقدمہ چلایا جائیگالیکن اگر جرم کا تعلق اس کی ریاست کی ذمہ داریوں سے متعلق ہے یعنی انتظامی یا حکومتی معاملات سے متعلق ہے تواس کا مقدمہ قاضی مظالم کی عدالت میں چلایا جائیگا۔ریاستِ اسلامیہ میں مطلقاً کسی کیلیئے بھی استثنیٰ نہیں سوائے ان سفیروں کے جو باہر سے آتے ہیں یعنی جن کو سفارتکاروں کا نام دیا جاتا ہے۔ صرف اُن کے لئے سفارتی استثنیٰ ہوتا ہے،ان کے علاوہ کسی اور کو یہ سفارتی استثنیٰ حاصل نہیں ہے۔

جمہوریت میں عام آزادیاں اسلام کے مخالف ہیں:

7) جمہوری نظام میں عام آزادیوں کے نام سے بہت سی آزادیاں پائی جاتی ہیں جیسے شخصی آزادی،ملکیت کی آزادی، مذہبی آزادی اوراظہارِرائے کی آزادی۔ لہٰذا ہر شخص جو چاہے کر سکتا ہے۔اس لئے زنا پر کوئی سزا نہیں پائی جاتی بلکہ زنا کیلیئے سزا مقرر کرنا ہی جائز نہیں کیونکہ سزا مقرر کرنا شخصی آزادی میں مداخلت ہے۔ ہر آدمی کیلیئے جائز ہے کہ وہ کسی بھی طریقہ سے جس چیز کا چاہے مالک بن جائے۔خواہ وہ جوا،ملاوٹ یاذخیرہ اندوزی ہی سے کیوں نہ مالک بنا ہو۔ نیز ہر انسان کواختیار ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہے اپنائے اور جس رائے کو چاہے صحیح کہے۔ یہ اسلام کے خلاف ہے کیونکہ اسلام میں کوئی آزادی نہیں پائی جاتی،یعنی اعمال کرتے ہوئے کسی چیز کا پابند نہ ہونا۔ بلکہ اسلام مسلمان کواحکام شریعہ کا پابند بناتا ہے۔ مسلمان کیلیئے ضروری ہے کہ وہ ہر عمل شرعی احکام کے مطابق کرے۔ جو کچھ عام آزادیوں کے نام سے جانا جاتا ہے،

اسلام میں ان کا وجود نہیں۔ لہذا کوئی شخصی آزادی نہیں، زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو کوڑے مارے جائیں گے اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جائیگا۔ ایسے ہی ملکیت کی آزادی بھی نہیں پائی جاتی۔ جوئے اور باطل طریقوں سے حاصل کی گئی دولت کا مالک نہیں بنا جا سکتا اور وہ مال جس کے لینے کو شریعت حرام قرار دے، جیسے سود، اس کی ملکیت بھی منع ہے۔ کسی آدمی کیلئے جائز نہیں کہ وہ دھوکہ یا ذخیرہ اندوزی سے کسی چیز کا مالک بن جائے۔ ایسے ہی اسلام میں مذہبی آزادی بھی نہیں پائی جاتی، مسلمان اگر مرتد ہو جائے اور توبہ نہ کرے تو قتل کیا جائیگا۔ اور جس آزادی کو اظہارِ رائے کا نام دیا جاتا ہے تو اسلام نے مسلمان کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو اور حق بات کہنے کو ہر جگہ اور ہر وقت ضروری قرار دیا۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار سے بیعت لیتے ہوئے فرمایا: **«وأن نقول بالحق حيثما كنا لا نخاف في الله لومة لائم»** "اس بات کا عہد کرو کہ ہم جہاں کہیں بھی ہونگے حق بات کریں گے، اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے"۔ اسلام نے حکمرانوں کا سامنا کرنے اور ان کے اعمال پر ان کا محاسبہ کرنے کو ضروری قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«سيد الشهداء حمزة ورجل قام إلى إمام جائر فنصحه فقتله»** "شہداء کے سردار حضرت حمزہؓ ہیں اور وہ شخص جو ظالم حکمران کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اس کو نصیحت کرے، تو وہ اس کو قتل کر دے"۔ یہ آزادیِ رائے نہیں بلکہ یہ شرعی احکامات کی پیروی ہے۔ بعض حالات میں آواز بلند کرنا مباح ہے اور بعض حالات میں فرض ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام جمہوریت میں موجود آزادیوں کی بناء پر اس کے مخالف ہے۔ اسلام میں کوئی آزادی نہیں، لے دے کر آزادی کا معنی غلاموں کو غلامی سے آزاد کروانا ہے۔

صرف ان سات نکات سے ہی اسلام اور جمہوریت کے درمیان مکمل اختلاف بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ جمہوریت کے احکامات اور اسلام کے احکامات ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کے درمیان واضح تضاد ہے۔ نیز ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بالکل مخالف ہے۔ لہذا جمہوریت اسلام سے ہٹ کر ہے۔

علاوہ ازیں مذکورہ باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ فکر جو کہتی ہے، "جو اسلام کے مخالف نہ ہو اور اس سے منع کرنے پر کوئی نص بھی وارد نہ ہوئی ہو تو اس کا لینا درست ہے"، یہ سراسر غلط فکر ہے اور دلائل کی باریک بینی سے کی گئی تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی بھی ایسا حکم لینا جو شریعت کے علاوہ ہو، کفر کا حکم لینا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے کے علاوہ کو اختیار کرنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت کے علاوہ فیصلہ لینے سے منع کیا ہے اور گزشتہ دلائل میں نہی کی وضاحت پر مزید اللہ تعالیٰ کے بہت سے اقوال ہیں جیسے: ﴿**فلا وربك لا يؤمنون حتى يُحكِّموك فيما شَجَرَ بَيْنَهم**﴾ "تیرے رب کی قسم یہ اُس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان جھگڑوں میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں"۔(النساء-65)۔ اور جیسے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد: «**كل عمل ليس علينا أمرنا فهو رَدٌّ**» "ہر وہ عمل جس میں ہمارا کوئی حکم شامل نہ ہو تو وہ عمل رد ہوا"۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر کسی ایسے حکم کو اختیار کرنے سے منع جس کو اللہ نے وحی نہ کیا ہو، اللہ نے اپنے رسول ﷺ سے کہا: ﴿**وأن احكم بينهم بما أنزلَ الله**﴾ "اِن کے درمیان اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلے کریں"۔(المائدۃ-49)۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **واحذَرْهم أن يَفْتنوك عن بعض ما أَنزلَ الله إليك**﴾ "اور ان سے محتاط رہیں کہ کہیں یہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (بعض احکامات) کے بارے میں آپ ﷺ کو فتنے میں نہ ڈال دیں"۔(المائدۃ-49)۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُن کی ملامت بھی کی جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ سے ہٹ کر حکم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**ومن لم يحكم بما أنزلَ الله فأولئكَ هم الكافرون**﴾ "اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کے مطابق حکم نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں"۔(المائدۃ-44)۔ ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**فأولئكَ هم الظالمون**﴾ "وہی لوگ ظالم ہیں"۔(المائدۃ-45)۔ اور تیسری آیت میں: ﴿**فأولئكَ هم الفاسقون**﴾ "وہی لوگ فاسق ہیں"۔(المائدۃ-47)۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحی کی پابندی پر زور دیتی ہیں اور اسی سے حکم لینے کا پابند کرتی ہیں اور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ حکم لینے سے منع کرتی ہیں۔ اس لیے مغربی قوانین اور جمہوری احکامات کو اپنانا صرف غلطی نہیں بلکہ کفریہ قوانین کو اپنانا ہے جو کہ حرام ہے، چاہے وہ شریعت سے متفق ہوں یا مخالف ہوں۔ حتیٰ کہ اگر بالکل ملتا جلتا حکم بھی اپنا لیا جائے تو وہ بھی حرام

ہی کہلائے گا کیونکہ وہ اس بنیاد پر اپنایا گیا ہے جو کہ شریعت کے علاوہ ہے۔اسی طرح مسلمان لین دین کے معاملات میں جو کچھ آج نافذ کرتے ہیں وہ مغربی قوانین کے مطابق ہے جو کفریہ احکامات کا نفاذ ہے اس بات سے قطع نظر کہ وہ شریعت سے متفق ہیں یا مخالف ہیں۔ حتی کہ اگر کوئی شخص کسی کو ملازمت پر رکھتا ہے یا مکان یا گاڑی کرائے پر لیتا ہے اور کرایہ نامہ مغربی قوانین کے تحت طے کیا جاتا ہے تو یہ معاہدہ اور کرایہ نامہ کفریہ قوانین کے تحت طے کیا گیا۔ جبکہ اگر اُس نے معاملات شریعت کے مطابق طے کیے ہوں تو وہ حلال اور جائز ہوں گے اس سے قطع نظر کہ وہ موجودہ قانون کے مطابق ہیں یا مخالف ہیں۔

ثقافتی اور قانون سازی کی یلغار کا اثر

مسلمانوں کی ان کمزوریوں کی وجہ سے وہ قوانین آئین کا حصہ بنے جو مغربی آئین اور قوانین سے لیے گئے تھے۔ نتیجتاً اسلامی ریاست کے خلیفہ کو کفریہ احکامات اپنانے پڑے۔ معاملہ جو بھی ہو، لیکن یہ ثقافتی حملہ ہی تھا جس نے سرزمینِ اسلام کو تباہ کیا اور حکومتی نظام اور ریاستی قوانین میں قانون سازی کا اختیار، جس نے مسلمانوں کے عقائد کو تباہ کیا اور کئی مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی افکار کو متزلزل کر دیا۔ اس سے بڑھ کر ریاستِ اسلامیہ کے وجود کو ہی مکمل طور پر ہلا دیا بلکہ کچھ حد تک اسے گرا ہی دیا اگرچہ وہ اپنی شکل میں موجود تھی۔ یہ اس لیے کہ ریاست کی اکائی کچھ افکار، معیارات اور اعتقادات اور لوگوں کے مجموعہ سے بنتا ہے جن تمام کو اتھارٹی باہم مربوط بناتی ہے۔ اگر مسلمانوں میں یہی افکار، معیارات اور اعتقادات تباہ ہو جائیں تو ریاست کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ ان کی موجود گی ،یعنی وہ بنیاد جس پر اتھارٹی قائم ہوتی ہے یا کم از کم اس کی بنیادیں بنتی ہیں، تباہ ہو جائیں گے چاہے اُس کا ڈھانچہ جوں کا توں رہے۔ اس لیے بعد میں اس ڈھانچے اور اس کی ظاہری شکل کو گرا لینا آسان ہو گا۔ اگر یہ ثقافتی اور قانون سازی یلغار نہ ہوتی تو کفار کی ریاستیں کبھی بھی ریاستِ اسلامیہ کو یہ ہلاکت خیز ضرب نہ لگا سکتے۔ لیکن جب کفار ممالک نے مسلمانوں کو قومیت میں اور بالخصوص ترک قومیت اور عرب پرستی میں بانٹ دیا، اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے افکار، معیارات اور اعتقادات کو ہلا کر رکھ دیا، شرعی احکامات کو زائل کر کے جمہوری نظام اور مغربی قوانین سے بدل دیا کہ مسلمان اسی سے فیصلہ لیں اور اسی کی بنیاد پر خلافت موجود ہو، یہ سب کچھ کرنے کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ اب ریاستِ اسلامیہ میں کچھ نہیں رہا سوائے اس ظاہری ڈھانچے کے جو اس کو مشکل سے ظاہری شکل دیے ہوئے ہے۔ اس لیے انہوں نے خلافت کو ختم کرنے اور بالآخر اس کے وجود ہی کو زائل کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی پہلی عالمی جنگ چھڑی اور خلافتِ عثمانیہ نے جرمنی کی طرفداری کا فیصلہ کیا تو کفار ممالک نے سمجھ لیا کہ خلافت کو ختم کرنے کا موقع آ گیا ہے، اس کے لیے انہوں نے کام شروع کر دیا۔

دولتِ خلافت کو ٹکرے ٹکرے کرنے کی کوشش

یورپی ممالک یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے ایک دن مسلمانوں پر اسلام سے ہٹ کر بھی حکمرانی ہو سکتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ براہ راست مسلمانوں پر حکمرانی کر سکتے ہیں، جبکہ مسلمان ان کو کافر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔اس لیے ان کی توجہ اس طرف مبذول تھی کہ ریاستِ اسلامیہ کو اپنے زیر اثر بہت سی اسلامی حکومتوں کی صورت میں پارہ پارہ کردیں تاکہ خلافت کو کمزور اور ختم کیا جاسکے۔اس کی دلیل وہ مذاکرات ہیں جو روس، برطایہ اور فرانس کے درمیان جنگ کے دوران مارچ 1915 میں ہوئے جو اس طرف اشارہ کررہے تھے۔وہ یادداشت جو کہ برطانیہ اور فرانس نے روس کی اس یادداشت کے جواب میں پیش کی تھی جو اس کے متعلق تھی،اس میں ایک فقرہ ایسے تھا،"خودمختار اسلامی ریاست کے زیر نگرانی اسلامی علاقوں اور عرب علاقوں میں مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت"۔روسی یادداشت جو برطانوی و فرانسیسی تجاویز کے جواب میں بھیجی گئی، یہ درج تھا:"ایک ایسا اہم فیصلہ لینا جو مستقبل میں ان اسلامی ممالک کے مابین تعلقات سے متعلق ہو جنھیں تم ریاستِ عثمانیہ کے تباہ شدہ ملبے پر قائم کر کے خلافت سے علیحدہ کرنا چاہتے ہو،ایسا معاملہ ہے جو عزت مآب زارِ روس(Czar) سے متعلق ہے"۔پھر اس میں مزید آیا:"عزت مآب زارِ روس کی حکومت تہہ دل سے ترکوں سے خلافت چھین لینے کی خواہش رکھتی ہے لیکن بیک وقت وہ تہہ دل سے حج کرنے کی آزادی کی حفاظت اور اس میں کوئی ایسا تعرض نہ کرنے کی خواہش بھی رکھتی ہے جس سے مسلمانوں کو پریشانی ہو"۔ لندن میں روس کے سفیر نے روسی وزیر خارجہ کو ایک تار بھیجا جس میں اطالوی مطالبات درج تھے:"اطالوی حکومت روسی حکومت کی اس رائے کی تائید کرتی ہے کہ عثمانی سلطنت کے ملبہ پر اسلامی حکومت،جو حجاز میں قائم ہو، اس کو خلافت سے علیحدہ رکھنے کی ضرورت ہے جو براہ راست برطانیہ کے زیر اثر ہو۔اطالوی حکومت ترکوں سے خلافت چھین لینے اور ضرورت پڑنے پر اس کے مکمل خاتمہ کی بھرپور تائید کرتی ہے"۔یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ ان اتحادیوں کا بنیادی مقصد خلافت کو کمزور اور ختم کرنا تھا۔لیکن مسلمانوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو کہ خلافت کا خاتمہ چاہتا ہو۔حتیٰ کہ عرب مسلمانوں کے وہ غدار جو انگریزوں کے ساتھ چل رہے تھے وہ بھی مطالبہ کرتے تھے کہ خلافت عربوں کے

پاس ہو۔ باقی رہے ترک تو ان سب نے خلافت کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ اس کے ساتھ محبت اور لگاؤ کی جڑیں ان کے دلوں میں بہت گہری تھیں۔ حتیٰ کہ Young Turks کی تنظیم بھی خلافت سے مخلص تھی اور ریاست کے تمام حصوں کو موجودہ حالت میں برقرار رکھنے کے لیے پر عزم تھے۔ کبھی نہیں سنا گیا تھا کہ کوئی خلافت کا خاتمہ چاہتا ہو یا اسے قبول کیا ہو، کجا کہ کوئی اس کے خاتمہ کیلئے کام کر رہا ہو گا۔ اس لیے اس کا خاتمہ ایک مشکل کام تھا حتیٰ کہ اگر تمام اسلامی علاقوں پر قبضہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس لئے اتحادی اپنے مقاصد کو چھپاتے تھے اور یہ راز تھا جس کے متعلق کوئی نہیں جانتا تھا۔ بلکہ وہ خلافتِ عثمانیہ کو اندر سے ضرب لگانے کیلئے کام کرتے تھے جس کیلئے انہوں نے اسے جنگ سے باہر نکالنے اور اس کے ساتھ الگ سے صلح کرنے کیلئے کئی کوششیں کیں۔ اس خیال پر انہوں نے توجہ مرکوز کی اور اسی کے لیے کام کرنے لگے۔

حلیفوں کی جمال پاشا کو اُکسانے کی کوشش

کوئی بھی شخص اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کو جنگ سے پیچھے ہٹانے پر یا علیحدگی اختیار کرتے ہوئے صلح کرنے پر کوئی اثرورسوخ رکھتا ہو، سوائے اہلِ اثر فوجی افسران کے جن کا اثرورسوخ تھا۔ اُن کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ کچھ کریں۔ باقی عربوں میں سے جو غداری کرتے ہوئے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ مل گئے تھے توان کا معیار سیاستدانوں کے برابر کا نہ تھا اور نہ ہی ان کے انگریز اور فرانسیسی آقا ان سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ ریاست پر اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ ان کا زیادہ سے زیادہ یہ کام تھا کہ وہ ریاست کے خلاف جاسوسی کریں اور اس کے خلاف تخریبی کاروائیاں کریں۔ حتیٰ کہ غدارِ اعلیٰ، شریف حسین ابنِ علی بھی ریاست پر اثرانداز ہونے کے اعتبار سے انتہائی کمزور تھا۔ اُس سے انگریز صرف اسلامی فوج کو سبوتاژ کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ عثمانی فوج کے خلاف تخریبی کاروائیوں کے لیے استعمال کریں تا کہ عوامی رائے کو اپنے ساتھ ملا سکیں کہ کہیں مسلمان ان کے خلاف دشمنی پر آمادہ ہو کر جہاد کا اعلان ہی نہ کردیں جسے شریعت نے واجب کیا ہے کیونکہ وہ کافر ہیں۔ اس لیے جنگ کے دوران خلافتِ عثمانیہ کو جنگ سے پیچھے ہٹانے میں حلیفوں کیلئے عرب توجہ کا مرکز نہ تھے، بلکہ انہوں نے اپنی توجہ ترک فوجیوں پر رکھی۔

ترک افواج میں دو فوجی ایسے تھے جو اول: جرمنی کیلئے ان کی نفرت اور خلافتِ عثمانیہ کا جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے جنگ میں شمولیت پر شدید اعتراض اور دوئم: ان کی حکومت پر قبضے کی خواہش اور اپنے اس مقصد میں ان کی کاوشوں کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ یہ دونوں فوجی افسران جمال پاشا اور مصطفیٰ کمال تھے۔ مصطفیٰ کمال تو ایک معمولی سا فوجی تھا جس کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی، اگرچہ وہ ذہین، بلند ہمت اور ریاست کے خلاف بڑا متحرک تھا۔ جبکہ جمال پاشا ایسا آدمی تھا جس کے ذریعے اثرانداز ہوا جاسکتا تھا، بالخصوص جبکہ پوری خلافتِ عثمانیہ کو تین ہی آدمی چلا رہے تھے: وزیرِ اعظم طلعت، وزیرِ جنگ انور اور خود جمال پاشا جو فورتھ ڈویژن (fourth division) کا کمانڈر اور شام کا حاکم تھا۔ اس لیے حلیفوں نے جمال پاشا کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ دردنیل (Dardanelles Campaign) پر حملہ کے دوران ناکامی پر اتحادیوں نے جمال پاشا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تا کہ اس سے

خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کروائی جائے۔اسکی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے استنبول پر حملہ کر دیا تھا اور غالیبولی(Gallipoli)پر25اپریل1915میں قبضہ کر لیا لیکن عثمانی فوج انکے سامنے دیوار بن گئی اور اُن کی پیش قدمی کو روک دیا۔ لہذا وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے اور انھیں زبردست نقصان اٹھانا پڑا حتیٰ کہ اتحادی افواج کا سربراہ جنرل ہملٹن16اگست کو برطانوی سیکرٹری جنگ، لارڈ کچنر(Lord Kitchner)کو تار بھیج کر مدد اور جنگی سازوسامان مانگنے پر مجبور ہو گیا۔14اکتوبر کو انگریز حکومت نے اس مہم کے سربراہ جنرل ہملٹن کو معزول کر کے اسکی جگہ جنرل چارلس مونرو(Charles Monro) کو تعینات کر دیا اور اسکے ذمہ لگایا کہ وہ دردنیل(Dardanelles Campaign)میں ناکامی کے اسباب تلاش کرے۔28اکتوبر کو وہ دردنیل پہنچا اور اس نے جنرل سٹاف کے ہمراہ دردنیل کی ساحلی پٹی اور انگریزی و فرانسیسی مورچوں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ پھر وزارت جنگ کو ایک خط لکھا جس میں اُس نے پیچھے ہٹنے کا مشورہ دیا۔ سیکرٹری جنگ لارڈ کچنر(Lord Kitchner)مونرو(Monro) کے اس تار سے پریشان ہو گیا اور خود دردنیل جانے کا فیصلہ کیا۔9نومبر کو وہ دردنیل پہنچا اور اس نے ساحلی پٹی پر دفاعی چوکیوں، نیز انگریزی اور فرانسیسی افواج کے مورچوں کا دورہ کیا۔وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اتحادی افواج اپنی چوکیوں کی حفاظت نہیں کر سکتے اگر ترک افواج جرمنی سے توپیں اور دیگر فوجی سازوسامان لیتے رہیں، اگر یہ سلسلہ جاری رہے گا تو اتحادی افواج کو مشکلات کا سامنا ہو گا۔ پھر یکم دسمبر کو اچانک اتحادی افواج نے اپنے مورچے چھوڑ دیے۔اس مشکل صورتحال جس میں سے اتحادی گزر رہے تھے اور وہ پریشانی جو انہیں دردنیل کے حملہ کی ناکامی کے دوران اٹھانا پڑی تھی، اتحادیوں نے جمال پاشا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تا کہ اُس کو خلافتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔اور نظریہ آتا ہے کہ حقیقت میں یہ روابط قائم ہوئے اور جمال پاشا نے راضی ہو کر اپنی شرائط رکھ دیں۔26نومبر 1915 کو روسی وزارت خارجہ نے پیرس اور روم میں اپنے دونوں سفارتخانوں میں تار نمبر(6391) بھیجا، جس میں لکھا تھا: "استنبول میں آرمینیائی حلقوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچنے والی خبروں کا خلاصہ یہ ہے جمال پاشا حکومت کے خلاف سخت اقدام اٹھانے کی خواہش رکھتا ہے جب مندرجہ ذیل شرائط پوری ہوں:

پہلی: اتحادی ممالک عثمانی ریاست کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے بلادِ شام، فلسطین، عراق، عربستان، کیلیکیہ، ارمینیہ، کردستان کی ریاستوں پر سلطان کی اتھارٹی کا اعتراف کریں۔

دوسری: حکومت احمد جمال پاشا سنبھالے گا اور اسکے بعد سلطنت اس کی اولاد اور پوتوں کی ہو گی۔

تیسری: جمال پاشا عہد کرتا ہے کہ وہ منادی کروائے گا کہ سلطان اور اس کی حکومت جرمنی کے ہاتھوں یرغمال ہو گئے ہیں اور وہ ان کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔

چوتھی: جمال پاشا کی موجودہ بغاوت اور حکومت سے جنگ کیلئے لشکر کشی کی صورت میں اتحادی اسلحہ، کھانے کا سامان اور اس کے لشکر کیلئے ضروری فوجی سامان مہیا کرنے کے پابند ہوں گے۔

پانچویں: جمال پاشا کیلئے جنگ کے خاتمہ تک ضروری مالی امداد مہیا ہو گی۔

چھٹی: جمال پاشا قبول کرتا ہے کہ وہ آبنائے اور استنبول اتحادیوں کیلئے چھوڑنے پر رضامند ہے۔

ساتویں: جمال پاشا وعدہ کرتا ہے کہ آرمینیا کی مدد کیلئے راستہ کھلا چھوڑے گا۔"

تار میں موجود شرائط سے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ روس نے انگریز اور فرانسیسیوں سے مذاکرات کیے اور انگریزوں اور فرانسیسیوں نے جمال پاشا کی شرطیں قبول نہ کیں جبکہ روس نے قبول کر لیں۔ 12 دسمبر 1915 کو روسی وزارت خارجہ کے چانسلر (Second Chancellor) نے بخارسٹ (Bucharest) میں تعینات سفیر کو تار نمبر (6130) بھیجا جس میں درج تھا: "جمال پاشا کی کسی بھی تجویز کردہ وعدہ کو پورا کرنا ممکن ہے اور ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ ضرورت پڑنے پر اتحادیوں سے وعدہ لے کر وہ دے سکتے ہیں جس کی وہ خواہش کرتا ہے"۔ لیکن بظاہر یہ لگتا ہے کہ اتحادیوں نے اتفاق نہیں کیا۔ 27 دسمبر 1915 کو پیرس میں متعین سفیر نے اپنی حکومت کو ایک تار بھیجا جس میں درج تھا: "تمہارا تار نمبر (6391) ہمیں ملا، اسکی ایک نقل مونسیور برائن (Monsieur Brian) کو پہنچا دی گئی ہے جس نے ان شرائط میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور اُس نے کہا کہ وہ کل ہی انہیں کابینہ کے

سامنے رکھے گا اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔ اس نے مجھ سے مزید کہا یہ شرائط اگرچہ ہمارے موافق ہیں تاہم وہ برطانوی عزائم سے مطابقت نہیں رکھتیں اور وہ اس کو رد کر دیں گے"۔

پھر فرانسیسی بھی شرائط قبول کرنے سے مکر گئے۔ 29 دسمبر 1915 کو سفیر نے پہلے تار کے پیچھے ایک اور تار بھیجا جس میں لکھا تھا"""میرے علم میں جو بات آئی ہے وہ یہ ہے کہ فرانسیسی وزراء نے اس معاہدے کی شدید طور پر مخالفت کی ہے یہاں تک کہ ان کی مخالفت کے اظہار میں ذرہ بھی کمی نہیں ہوئی"۔ پھر مزید کہا: "فرانسیسی تمہاری بعض تجاویز کی قدر کرتے ہیں اور سلطنتِ عثمانیہ میں بغاوت کھڑی کرنے کی اہمیت سے بھی آگاہ ہیں۔ بلکہ ان کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بغاوت عالمی جنگ میں ان کے لیے بھی بہت فائدہ مند ہے۔ تاہم فرانسیسی یہ دیکھتے ہیں کہ جمال پاشا کے ساتھ مذاکرات کیلئے آپ کی تجاویز صرف استنبول اور آبنائے پر قبضے کی خواہش کو ظاہر کرتی ہیں، اس بات کو مدِ نظر رکھے بغیر کہ مشرق میں فرانس بھی اپنا غلبہ چاہتا ہے"۔

اسکے بعد برطانیہ نے بھی ان مذاکرات میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ 27 جنوری 1916 کو لندن میں مقیم روس کے سفیر نے پیٹرس برگ (Petersburg) میں روسی وزیر خارجہ کو ایک تار بھیجا جس میں لکھا تھا: "نیکولیس نے مجھے مطلع کیا ہے کہ اس معاملہ کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کرنے اور اسکے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد برطانوی حکومت ضروری سمجھتی ہے کہ ان مذاکرات میں شرکت نہ کی جائے اور یہ کہ اس سے بالکل دست بردار ہوا جائے"۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اتحادیوں کی بنیادی سوچ ترکوں کو جنگ سے پیچھے ہٹانا اور بعض افسران کو اقتدار پر قبضہ کے لیے ابھارنا تھا۔ وہ خلافتِ عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور خلافت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ تاہم جمال پاشا کی اسلامی سرزمین کو متحد رکھنے، اگرچہ وہ وفاقی شکل میں ہی کیوں نہ ہو، اور خلافت کو محفوظ رکھنے کی شرائط کی وجہ سے اس کی تجاویز کو انہوں نے یکسر مسترد کر دیا اور اسکے ساتھ مذاکرات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اور یہ فطری بات ہے کہ انہوں نے پھر دیگر کوششیں بھی کی ہوں گی۔

باقی رہی شریف آف مکہ حسین ابن علی کے ساتھ مل کر کی جانے والی سازشیں، تو وہ سب کو معلوم تھیں۔ لیکن یہ کوششیں خلافتِ عثمانیہ کو جنگ سے پیچھے ہٹانے میں فائدہ نہ دے سکتی تھیں اور بلاشبہ انھوں نے کئی ترک افسران کے ساتھ بہت سی کوششیں بھی کی ہوں گی۔ یہاں پر کوئی بھی چیز اس بات کا اشارہ نہیں دیتی کہ تُرکوں میں کسی اور کے ساتھ بھی مذاکرات ہوئے لیکن ریاست کے اندر عارف پاشا اور داماد فرید وغیرہ جیسے برطانوی ایجنٹ موجود تھے۔ پہلی عالمی جنگ سے پہلے برطانیہ کا فوجی اتاشی (ایچ ایس آرم سٹرانگ) بہت سرگرم تھا جو کافی متحرک تھا اور اُس کے کافی روابط بھی تھے، اس کو مکمل چھوٹ حاصل تھی۔ یہ فوجی اتاشی جنگ بندی کے معاہدہ کے بعد واپس استنبول آیا اور اتحادی افواج کے سربراہ ہارنگٹن کے ساتھ مل کر خلافت کو ختم کرنے کیلئے ایک اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا کوئی بعید نہیں کہ اپنی غیر موجودگی میں اس نے رابطے بحال رکھے ہوں اور کئی تعلقات بنائے ہوں لیکن ان میں کچھ بھی عیاں نہیں ہوا۔

مصطفی کمال کا نمایاں ہونا:

جنگ کی ابتداء میں مصطفی کمال ایک معمولی سا گمنام فوجی تھا، اگرچہ وہ اپنے مغربی افکار، اسلامی افکار کے خلاف بغاوت، انگریزوں کی طرف میلان اور جرمنی سے نفرت کیلئے مشہور تھا۔ انافورطہ (Ana Forta) کی جنگ میں شرکت کے بعد اس کا نام ظاہر ہوا۔ اس وقت سے اس کا تذکرہ عام ہوا اور وہ مشہور ہو گیا۔

1915 کے موسم بہار میں یعنی عالمی جنگ کے دوسرے سال کی ابتداء میں جرمنی نے فرانسیسی علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں ترک کر دیں کیونکہ جرمنی اور فرانس نہ تو ایک دوسرے کو شکست دے سکتے تھے اور نہ ہی حتمی طور پر ایک دوسرے پر فتح یاب ہو سکتے تھے۔ روس بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا اور وہ رسوائی سے اُس وقت تک نہیں نکل سکتا تھا اور نئے سرے سے لڑائی میں حصہ نہیں لے سکتا تھا جب تک کہ مغربی ممالک ہنگامی طور پر اور منظم طریقے سے روس کو فوجی ساز و سامان کے ساتھ مدد نہ دیں، جس کی اُس کو اس وقت سخت ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے مغربی اتحادیوں نے کشتیاں لادیں لیکن بحر روم میں ان کا گھیراؤ ہو گیا اور وہ روس تک نہ پہنچ سکیں۔ لہذا

جہازوں کے مستقل داخلہ اور روس کی منظم طریقے سے مدد کیلئے استنبول پر حملہ اور آبنائے کو کھولنا گزیر ہو گیا تھا۔ عثمانی فوجوں کی قیادت اس وقت ایک جرمن جنرل لمان فون ساندروز(Liman von Sanders)کے ہاتھ میں تھی۔اس نے ایک ڈویژن کی ذمہ داری مصطفی کمال بیک کو سونپی ہوئی تھی اور یہی وہ وقت تھا جب اتحادیوں کی طرف سے استنبول پر حملہ ہوا۔

اپریل 1915کو انگریزوں نے جنگ کی پوری تیاری کے بعد ایک بھرپور حملہ کی کوشش کی۔وہ جنگ میں کود پڑے اور برطانوی فوج غالیبولی(Gallipoli)تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور اُسے عثمانی دستوں کو تتر بتر کرنے میں بھی کامیابی حاصل ہوئی۔جنرل ساندرز(Sanders)اس جنگ کے کمانڈر کو معزول کرنے پر مجبور ہو گیا اور اُس کی جگہ مصطفی کمال کو تعینات کر دیا جو اُس وقت صرف ایک کرنل تھا۔مصطفی کمال دردنیل کے قریب ایک حساس ترین جگہ (انافورطہ) میں عثمانی فوجیوں کی قیادت کرنے لگا۔جنگ ایک وادی میں ہو رہی تھی جس کی چوٹی پر ترکوں کا قبضہ تھا اور انگریز دامن میں تھے اور پورے پہاڑ پر قبضہ کی کوشش کر رہے تھے۔یہ معرکہ کئی دنوں تک جاری رہا، دونوں جنگی فریقوں میں سے کسی کا بھی مکمل غلبہ نہ ہو سکا۔صورتحال یوں ہی رہی، عثمانی اپنی چوکیوں کی حفاظت کرتے رہے اور انگریز اپنی چوکیوں کی، جبکہ جنگ جاری تھی۔

کئی مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن 15 دسمبر کی رات اچانک ہی پراسرار طور پر انگریز نے غالیبولی کے ساحل پر اپنا قبضہ چھوڑ دیا۔حیران کن طور پر بہت جلدی میں جنگی کشتیاں تیار کی گئیں اور لنگر اٹھا لیے گئے۔اس انخلاء سے ہی اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔

جب جنگ ختم ہوئی تو مصطفی کمال نے جرمن سپہ سالار کو میدان جنگ سے متعلق رپورٹ پیش کی۔اس رپورٹ کے ساتھ اُس نے وہ گھڑی بھی پیش کی جو ایک گولی لگنے سے چکنا چور ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ بچ گیا تھا۔جب ساندرز(Sanders)نے وہ گھڑی دیکھی تو فوراً اپنی سونے کی گھڑی نکالی اور مصطفی کمال کو تحفے میں دے دی اور اس سے اُس کی ٹوٹی ہوئی گھڑی لے لی تاکہ اس کو بطور یادگار محفوظ کر لے۔

اس لڑائی سے مصطفی کمال کا ستارہ چمک اٹھا۔ عثمانی فوج میں اس کی بہت زیادہ شہرت ہو گئی۔اس جیت کو عوام میں بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی اوراس کو برطانیہ کے خلاف مصطفی کمال کی عظیم فتح شمار کیا گیا۔ لیکن مصطفی کمال تو جنگ میں شریک نہ ہونے کی سوچ کا حامل تھا،انا فورطہ کی لڑائی سے شہرت کمانے کے باوجود بھی وہ اپنی اس فکر پر ڈٹا رہا کہ عثمانی ریاست کو جنگ سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔وہ صرف اسی پر مطمئن نہ ہوا بلکہ فوج اور لوگوں میں شہرت حاصل ہونے کے بعد وہ اثرورسوخ کی حامل شخصیات پر اثرانداز ہونے کی کوشش کرنے لگا تا کہ وہ اس کی سوچ پر قائل ہو جائیں لیکن اُس کو اُن کی طرف سے بیزاری اور ناگواری کا سامنا کرنا پڑا۔اس وجہ سے اُس کی شخصیت مشکوک ہو گئی۔ اس کی جنگی صلاحیتوں پر اعتماد کے باوجود کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کیلئے اس کی حوصلہ افزائی کرتا کہ وہ ملک کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کرے، بلکہ جب بھی وہ ملکی سیاست میں عملی طور پر شرکت کرنے کی کوشش کرتا،وہ اس کی مخالفت میں کھڑے ہو جاتے تھے۔وہ انگریزوں کی برتری کو تسلیم کرتا تھا،ان پر اعتماد کرتا،ان کی طاقت پر یقین رکھتا اور یہ مانتا تھا کہ لا محالہ وہی کامیاب ہونے والے ہیں اور جرمنی شکست کھا جائے گا اور اسی وجہ سے وہ شک کا محور بن گیا۔ حتیٰ کہ اگر کسی آدمی کا ملنا جلنا اس سے زیادہ ہوتا تو وہ ایجنسیوں کی نظر میں مشکوک ہو جاتا اور اُس کی نگرانی کی جاتی۔

مصطفی کمال کا ریاست کو جنگ سے پیچھے ہٹانے اور انگریزوں کی ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے کیلئے کام کرنا

جو چیز توجہ طلب تھی وہ مصطفی کمال کا درد نیل میں انگریزوں پر فتح یاب ہو کر استنبول لوٹنا تھا۔ اس کی اس کامیابی کا عثمانی فوج کے جذبات اور خلافتِ عثمانیہ کے مسلمانوں کے دلوں پر کافی اثر تھا۔ اس کا اثر اتحادیوں پر بھی تھا۔ بہر حال مصطفی کمال جب جنگ سے واپس لوٹا تو اس نے لوگوں میں ان شکوک کو ہوا دی کہ خلافتِ عثمانیہ برطانیہ کے ساتھ جنگ کی صلاحیت نہیں رکھتی اور ریاست کو جنگ سے واپس موڑنے اور برطانیہ کے ساتھ یکطرفہ امن معاہدے کے خیالات کا پرچار کیا، تاکہ ریاست کے اندر ایک جنگ شروع ہو اور وہ جرمنی کا ساتھ چھوڑ کر انگریزوں کے ساتھ چلے۔ اگر معرکہ سے پہلے اس قسم کی اُس کی کوئی رائے تھی تو اس نے اُسے اپنے تک ہی محدود رکھا، لیکن اب جبکہ وہ لوٹ آیا تھا تو اس نے یہ آراء لوگوں کے درمیان پھیلانی شروع کر دیں، بالخصوص فوجی افسران اور بڑے بڑے محکموں کے ذمہ داران اور اہلِ اثر پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ حتی کے اُس نے وزراء سے ملاقاتیں شروع کر دیں اور اُن پر اپنی آراء کا اعلانیہ طور پر اظہار کر کے اُن پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔

ان میں سے ایک موقع پر وہ وزیر خارجہ کو اس کے دفتر ملنے گیا۔ اس وقت وزیر خارجہ نسیمی بک (Nasimi Beik) تھا جو اُن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے ترکی کو جرمنی کے اتحادی کے طور پر جنگ میں شامل ہونے کی تجویز پیش کی تھی۔ نسیمی بیک نے مصطفی کمال کا استقبال انافورطہ (Ana Forta) کے ہیرو کے طور پر کیا اور اس کے ساتھ بڑے خوشگوار انداز میں گفتگو کرنے لگا۔ اس کی تمام تر گفتگو اچھے شگون کے متعلق تھی، بالخصوص وہ کامیابی جو ریاست نے اتحادی افواج کو درد نیل پر شکست دے کر اور ان کو پیچھے ہٹا کر حاصل کی تھی۔ وزیر خارجہ کو اس کامیابی کی قیمت کا اندازہ تھا اور اتحادیوں پر اس شکست کے اثرات کا علم بھی تھا جس وجہ سے روس اُس فوجی سازو سامان کی فراہمی سے محروم ہو گیا تھا جس کی اُسے سخت ضرورت تھی اور جس وجہ سے فرانس جرمنی کے تباہ کن

حملے کے زیر اثر رہے گا کیونکہ رسد کی فراہمی نہ ہونے کی وجہ سے روس جنگ کے قابل نہیں رہا تھا اور یوں جرمنی مشرقی سمت سے محفوظ ہو جائے گا۔ اس وجہ سے طاقت کا توازن جرمنی اور خلافتِ عثمانیہ کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اس لیے وزیر خارجہ اس کو اچھا شگون لے رہا تھا۔ لیکن مصطفی کمال نے مایوسی پھیلانے کی کوشش کی اور وزیر کو اپنی آراء پر قائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب اُس نے یہ محسوس کیا کہ وزیر کے دلائل میں وزن ہے تو اس نے دھمکی کا سہارا لیا اور وزیر سے کہا: "جو میں کہنے لگا ہوں اسے غور سے سنیں! اگر آپ نے یونہی ان سیاستدانوں کو اپنے اوپر اثر انداز ہونے دیا تو آپ ایسی مشکلات میں گھر جائیں گے جس کا نہ آپ اور نہ ہی آپ کے ساتھی سیاستدان تصور کر سکتے ہیں"۔ اس پر وزیر مضطرب ہو گیا اور اس نے تکبر سے کہا: "مجھے نہیں معلوم کہ تمہارا کیا مقصد ہے"۔ مصطفی کمال نے کہا: "میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ریاست تباہی کی طرف جا رہی ہے اور آپ اس تباہی کو نہ دیکھنے کا دکھاوا کر رہے ہیں۔ کیونکہ بحیثیت وزیر ہونے کے آپ یہ بات کہنے پر مجبور ہیں لیکن آپ کی ذاتی سوچ یقیناً اس سے مختلف ہونی چاہیے۔ بیشک آپ تمام حقیقت سے واقف ہیں اور بیشک آپ جانتے ہیں کہ بیماری کی جڑ اور مسئلہ کس جگہ ہے"۔ وزیر ششدر رہ گیا۔ پھر مصطفی کمال کی طرف متوجہ ہوا اور گرجدار انداز سے کہا: "کرنل! اگر آپ ملک کے حالات کے متعلق اپنے شکوک ظاہر کرنے آئے ہیں تو یہ وقت اور جگہ ان شکوک کے اظہار کا نہیں ہے۔ میرے پاس آکر آپ نے غلطی کی۔ میں اپنے دیگر ساتھی وزراء کے ساتھ ہوں اور ہم اپنی فوجی کمانڈ پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ اس بنا پر میں آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ آپ ان کے پاس چلے جائیں تاکہ وہ آپ کے خدشات کو دور کر دیں اور ان وسوسوں کو ختم کر دیں جو آپ پر غالب ہیں"۔ پھر اُس کو اپنے دفتر سے نکال دیا۔

اگلے دن صبح وزیر خارجہ نے کمانڈر انچیف کو وہ تمام باتیں پہنچا دیں جو اس کے اور مصطفی کمال کے درمیان ہوئیں اور مطالبہ کیا کہ وہ اس کو سزا دیں جس کا وہ مستحق ہے۔ کمانڈر انچیف نے مصطفی کمال کو قفقاس (Caucasus) بیدخل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس کو فوراً بیدخل کر دیا گیا جہاں پر وہ ایک سال رہا اور اُس کو کوئی بھی قابل ذکر کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

وزیر خارجہ سے مصطفی کمال کی یہ ملاقات ریاست کو جنگ سے ہٹانے اور اس کے ساتھ ریاست کے وزراء اور افسران کو اپنا ہم خیال بنانے کی پہلی باقاعدہ کوشش تھی۔ اس وقت بظاہر کوئی شواہد موجود نہ تھے جن سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ یہ سب کچھ انگریزوں کے ساتھ مخصوص تعلقات کی وجہ سے کر رہا ہے۔ اس لیے اس کے اس عمل کو اُس کی اپنی ذاتی رائے اور کوشش سمجھا گیا۔ اور اس کو بیدخل کر کے ریاست نے اس فکر سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ لیکن اس کے بعد بہت سے واقعات پیش آئے جس میں مصطفی کمال نے اپنی افکار کو بزورِ قوت نافذ کرنے کی کوشش کی اور حکومت پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کرنے کی کوشش کی جس سے اس کی غداری ظاہر ہوئی۔

ریاست کے خلاف مصطفی کمال کی سازش:

پہلا واقعہ اس وقت رونما ہوا جب وہ قفقاز (Caucasus) میں تھا۔ ایک فوجی بغاوت کرنے کی کوشش کی گئی اور خیال یہ ہے کہ اس کے پیچھے مصطفی کمال تھا۔ میجر یعقوب جمیل بک نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ اُس وقت اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "یہ لوگ جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں حقیقت میں چھوٹے ہیں اور ریاست اُن کو ان کے عہدوں سے ہٹانے کا تقاضا کرتی ہے تاکہ ایسے لوگ ان پر براجمان ہوں جو زیادہ محب وطن اور زیادہ مخلص ہوں"۔ بعض ساتھیوں نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا: "ان کو ہٹانا آسان کام ہے لیکن ہمیں وہ شخص بتائیں جس کے بارے میں آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں اِتنی ہمت ہے کہ وہ نظام کو پہلے کی طرح چلا سکے"۔ اس نے فوراً جواب دیا: "مصطفی کمال"۔ یہ سازش بعد میں بے نقاب ہوگئی، میجر یعقوب اور اُس کے ساتھیوں کو سزائے موت دی گئی۔ مصطفی کمال پر یہ خبر قفقاز (Caucasus) میں قیام کے دوران بجلی کی طرح گری۔ یہ ساری خبریں اس کو ڈاکٹر حِلمی بک کے ذریعہ پہنچی جو کہ اس سازش میں سہولت کار تھا، لیکن وہ استنبول سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور مصطفی کمال کے پاس پہنچ گیا۔ استنبول حکومت نے مصطفی کمال کو حکم دیا کہ وہ ڈاکٹر حلمی کو گرفتار کر کے واپس کرے لیکن مصطفی کمال نے ایک تار بھیجا جس میں وہ کہتا ہے: "اب سے ڈاکٹر حلمی میری حفاظت میں ہے"۔ حکومت کیلئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموش ہو جائے کیونکہ مصطفی کمال کے ساتھ ٹکرانے کے منفی نتائج

متوقع تھے۔ اس طرح حکومت، ریاست کے متعدد افراد اور فوج پر یہ بات عیاں ہوگئی کہ مصطفی کمال اقتدار پر قبضہ کرنے اور جنگ سے دور رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس طرح مصطفی کمال سیاسی منظر نامہ پر صرف اپنے افکار کے ساتھ ہی ظاہر نہیں ہوا بلکہ اس طریقہ کار کے ساتھ بھی جس کے ذریعے وہ ان افکار کو نافذ کر سکے۔ اس لیے اس سے احتیاط اور سمجھ بوجھ کے ساتھ نمٹا جانے لگا۔

دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب ریاست نے روم کی سرزمین پر شکست کھائی اور مارچ 1917 میں انگریزوں کے ہاتھوں سقوطِ بغداد ہوا۔ مصطفی کمال کی ریاست کے خلاف جرأت واضح طور پر سامنے آئی اور وہ اعلانیہ طور پر جنگ سے پیچھے ہٹنے کا مطالبہ کرنے لگا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ روم کی سرزمین پر جب روسی حملوں میں شدت آئی تو وہ ان کے قبضے میں چلا گیا۔ قلعہ کھونے کا زخم قابلِ برداشت تھا اور اربابِ اختیار اس بھیانک سازش کو چھپانے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ تاہم برطانیہ نے عراق پر حملہ کر دیا اور ان کے ہاتھوں بغداد کا سقوط ہوا تو ریاست کی کمزوری اور اُس کی شکست واضح ہو گئی۔

انگریزوں نے ہندوستان کی طرف سے ایک لشکر لا کر عراق پر حملہ کر دیا تھا لیکن عثمانی افواج نے ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور برطانوی فوج کشی کی مہم کو روک دیا۔ اس کے ساتھ وہ مزید آنے والی انگریزی کمک کو بھی روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ عثمانی افواج نے تومشند (Tomshend) کے ایک دستے کو کوت العمارة (Kut Al-Amara) کے محاصرہ کے دوران 29 اپریل 1916 کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیا اور سب کو قیدی بنا لیا۔ لیکن عراق میں اترنے والی برطانوی افواج کی تعداد عراق میں موجود عثمانی افواج سے زیادہ تھی، لہذا برطانیہ کی فوجی برتری کئی لڑائیوں میں ظاہر ہونا شروع ہو گئی اور طاقت کا پلڑا بھی انگریزوں کی طرف جھک گیا۔

فروری 1917 میں انگریزوں نے کوت العمارة پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ مارچ 1917 میں بغداد بھی ان کے زیر تسلط آگیا اور انہوں نے موصل (Al-Moosil) کی طرف نئے سرے سے پیش قدمی شروع کر دی۔ ریاست میں کھلبلی مچ گئی اور عوام اس رائے کا اظہار کرنے لگے کہ انور کو وزارتِ جنگ سے معزول کر کے کسی دوسرے شخص کو

یہ ذمہ داری سونپی جائے۔ حتی کہ "اتحاد وترقی"(Union&Progress) کی تنظیم جو کہ حکومت کر رہی تھی اور انور ان کے نمایاں ترین لیڈروں میں سے تھا، وہ بھی اس رائے کے حق میں تھے۔

اس لیے اب بحث یہ شروع ہو گئی تھی کہ کون اس قابل ہے جو وزارتِ جنگ میں انور کی جگہ لے۔ اس عہدے کے لیے جو نام تجویز کیے گئے وہ جمال پاشا، مارشل عزت اور مصطفی کمال تھے۔ لیکن جمال پاشا شام کے والی کی حیثیت سے ناکام ہو چکا تھا اور مارشل عزت کا سیاست کا کوئی تجربہ نہیں تھا جبکہ وزارتِ جنگ میں سیاسی معاملات کی سوجھ بوجھ اور تجربہ کی ضرورت تھی۔ لہذا جمال پاشا اور مارشل عزت کو انور کی جگہ نامزد کرنا شدید غلطی ہوتی، اب صرف مصطفی کمال ہی رہ گیا تھا۔

لیکن یہ بات مشہور تھی کہ مصطفی کمال حکومت کا تختہ الٹنا اور جنگ سے پیچھے ہٹنا چاہتا ہے۔ جنگ کے متعلق اس کی آراء بھی سب کو واضح تھیں۔ لہذا اسے مسترد کر دیا گیا کیونکہ وہ حکومت کو لکھتا رہتا تھا کہ وہ جنگ سے پیچھے ہٹ جائے۔ اُسے یقین تھا کہ جرمنی سیاسی محاذ پر جنگ ہار چکا تھا اور اب وہ جنگ کے میدان میں جیتنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کو اس بات میں شک تھا کہ کیا عثمانی ریاست اپنے آپ کو جنگ سے دور کر پائے گی؟ کیونکہ وہ ضروری سمجھتا تھا کہ اتحادی(Allies) الدردنیل(Dardanelles) میں اپنی ایک گزرگاہ رکھیں تاکہ مشرق میں واقع اتحادی ممالک سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔ دوسری طرف سے روس عثمانی سلطنت کا جانی دشمن شمار کیا جاتا تھا۔ مصطفی کمال سے متعلق یہ سب آراء مشہور تھیں اور وہ ان سب کا آزادانہ طور پر اظہار بھی کرتا تھا۔ اس لئے کسی کو ذرہ برابر شک نہ تھا کہ اگر مصطفی کمال نے فوج کی سپہ سالاری سنبھال لی تو وہ ریاست اور اس کی سیاست میں بنیادی تبدیلیاں کر دے گا۔ اس لئے انور کی معزولی کا مطالبہ کرنے والوں کی آوازیں خاموش ہو گئیں اور وہ بغداد کو جلد از جلد واپس لینے کا مطالبہ کرنے لگے۔

انور نے جرمن ہائی کمان سے رابطہ کیا اور ان سے اس بات پر مسلسل زور دیا کہ وہ بغداد پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے اسے کمک(reinforcements) فراہم کریں۔ جرمنوں نے اپنی طرف سے اپنے اتحادی انور کی مدد

کرنے اور اسے عہدے پر قائم رکھنے کے لیے بہت کوشش کی۔ انہوں نے جو اقدامات اٹھائے ان میں سے ایک جنرل ایرک وان فیلکن ہائن(General Erich von Falkenhayn)اور بڑی تعداد میں دستوں کو اس کے زیر انتظام رکھنا تھا۔ فیلکن ہائن نے ایک نئی فورس بنائی جسے اس نے تھنڈر بولٹ(Thunderbolt) کا نام دیا اور حلب اس کا جنرل کمانڈ ہیڈ کوارٹر تھا۔ مصطفیٰ کمال کو جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر فیلکن ہائن کی جنرل کمان کے تحت چوتھی فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔

مصطفیٰ کمال جرمنوں میں سے کسی کے ہاتھ میں جنرل کمان رکھنے کے خیال کے خلاف تھے۔ اس نے بغداد کو واپس حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی کسی بھی کوشش کو فضول سمجھا اور یہ کہ اسے واپس لینے کے لیے کی جانے تمام تر کوششیں بے کار ہیں۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ اس طرح کا اقدام عثمانی فوج کے لیے تازہ اور بھاری نقصان کا باعث بنے گا۔ نتیجتاً اس نے ملک کے سامنے بغداد پر دوبارہ قبضے کا مطالبہ کرنے والوں کی جہالت اور انور کی پالیسیوں کی غلطی کو ثابت کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس نے اس ٹیڑھی پالیسی کے نتیجے میں ملک کو پہنچنے والے نقصان کا خاکہ بھی پیش کیا۔ پھر اس نے اپنی تقریروں میں ان نقصانات کے بارے میں تفصیل سے بات کرنا شروع کی جو جرمنوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی وجہ سے عثمانی ریاست کو اٹھانے پڑے۔ اس طرح اس کا جرمن کمانڈر کے ساتھ تصادم ناگزیر تھا۔ جرمن کمانڈر Falkenhayn نے اپنی طرف سے اسے جیتنے اور ہر ممکن طریقے سے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اس نے مصطفیٰ کمال کو اجازت دی کہ وہ ہائی کمانڈ کی ملاقاتوں میں شامل ہو۔

منصوبہ یہ تھا کہ بغداد پر زمینی اور نہر سویز پر ہوائی حملہ کیا جائے۔ نہر سویز پر حملہ کرنے سے برطانوی افواج عراق میں موجود اپنی افواج کو کمک فراہم نہیں کر سکیں گی۔ تاہم، مصطفیٰ کمال نے اس منصوبے پر تنقید کی اور اس پر شدید حملہ کرتے ہوئے اسے ناکامی سے دوچار قرار دیا۔ تاہم جرمنوں نے اس کی مخالفت اور اس کی تنقید کو نظر انداز کیا اور جمال پاشا کے علاوہ کسی نے بھی اس کے خیالات کی حمایت نہیں کی کیونکہ وہ بھی یہی رائے رکھتا تھا۔ در حقیقت، وہ ایسے دو افسران کے طور پر جانے جاتے تھے جو جرمنوں سے نفرت کرتے تھے اور جنہوں نے جنگ سے ریاست کے

انخلاء کی وکالت کی۔ چنانچہ جمال پاشا اعلیٰ کمان کے ساتھ ہونے والی بات چیت میں مصطفیٰ کمال کے شانہ بشانہ کھڑا رہا، لیکن منصوبہ عمل میں ہی رہا کیونکہ کمانڈران چیف فیلکن ہائن اور دیگر کمانڈروں نے اسے درست اور کامیاب سمجھا۔

پھر مصطفیٰ کمال اور فیلکن ہائن کے درمیان جھگڑے کی وجوہات یکے بعد دیگرے سامنے آئیں۔ ایک دن، جنگی کابینہ نے منصوبوں پر عمل درآمد شروع کرنے کے لیے ملاقات کی۔ اجلاس گرما گرم بحثوں سے چھایا ہوا تھا۔ فیلکن ہائن نے مصطفیٰ کمال کو سخت الفاظ میں مخاطب کیا جبکہ مصطفیٰ کمال نے اپنی جانب سے نرمی سے جواب دیا۔ آخر کار مصطفیٰ کمال نے اپنا استعفیٰ پیش کیا لیکن انور نے اسے مسترد کر دیا اور اسے قفقاز (Caucasus) واپس جانے کا حکم دیا۔ تاہم، مصطفیٰ کمال نے اس بار حکم کی تعمیل نہیں کی اور جانے سے انکار کر دیا، یوں انور اپنے حکم سے پیچھے ہٹ گیا اور اس نے سوچا کہ ایسی عجیب و غریب صورت حال سے چھٹکارا پانے اور اپنی بغاوت کو چھپانے کا بہترین انداز اسے غیر معینہ مدت کے لیے بیماری کی رخصت دے دینا ہے۔ تاہم فیلکن ہائن نے اس چھٹی سے اتفاق نہیں کیا اور کورٹ مارشل سے قبل اس باغی کمانڈر کے خلاف مقدمہ چلانے کا مشورہ دیا۔ آخر کار انہوں نے اسے رخصت دینے پر اتفاق کیا۔ اس وقت مصطفیٰ کمال حلب (Aleppo) میں تھا۔ اس نے شہر چھوڑنے کی کوشش کی اور انکشاف کیا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت وہ گھوڑوں کی دس اچھی نسلوں کا مالک تھا اور انہیں بیچنا چاہتا تھا، لیکن اسے کوئی خریدار نہیں مل سکا۔ اس پر جمال پاشا نے اس کی مدد کرنے کی پیشکش کی تو اس نے اسے £2000 دیے اور استنبول واپس آنے کے بعد مزید £3000 بھیجے۔ لہٰذا ان سرگرمیوں کو اپناتے ہوئے، مصطفیٰ کمال عثمانی ریاست کے برطانیہ کے ساتھ تنازعے کے معاملہ میں واضح طور پر عثمانی ریاست سے متصادم دکھائی دیا۔

مصطفیٰ کمال کی اقتدار حاصل کرنے کی مسلسل کوشش:

جہاں تک تیسرے واقعہ کا تعلق ہے، اس نے اس حقیقت کی عکاسی کی کہ یہ مسئلہ اب محض ایک رائے کا اظہار اور محض ایک بغاوت نہیں رہا، کیونکہ مصطفیٰ کمال نے اقتدار پر قبضہ کرنے کی جدوجہد مسلسل طور پر کرنا شروع کر

دی۔ اس نے بہت سی سرگرمیاں بھی کیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے برطانیہ کے ساتھ رابطہ قائم کیا تھا۔

3 جولائی 1918ء کو سلطان محمد رشاد کا انتقال ہوا اور ان کے بعد محمد وحید الدین تخت نشین ہوئے، جنہیں بصورت دیگر محمد پنجم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مصطفٰی کمال نے فیصلہ کیا کہ اب اس کے لیے اقتدار پر قبضہ کرنے کا موقع آ گیا ہے، کیونکہ وہ وحید الدین کے ساتھ ابھی جرمنی گیا تھا جہاں ان کی ملاقات ہنڈن برگ (Hindenburg) سے ہوئی۔ انور نے مصطفٰی کمال کو وحید الدین کے ساتھ جرمنی بھیجا تھا، جو اس وقت ولی عہد تھا، تاکہ مصطفٰی کمال جرمنی کی طاقت خود دیکھ لے، اس امید پر کہ شائد وہ اپنے خیالات بدل لے۔

وہ اپنے سفر سے واپس لوٹے ہی تھے کہ محمد رشاد کی موت واقع ہو گئی اور وحید الدین تخت نشین ہو گئے۔ وحید الدین کے ساتھ رہنے کے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مصطفٰی کمال نے کوشش کی کہ اُن کو اپنی آراء پر قائل کرے تاکہ وہ اسے حکومت کا سربراہ مقرر کر دیں۔ اس نے دوستانہ بنیادوں پر ان نئے سلطان سے ملاقات کی اور وحید الدین نے بھی گرمجوشی اور شائستگی سے اس کا استقبال کیا۔ وحید الدین نے اسے خوش آمدید کہا اور اس کے لیے سگریٹ بھی جلا دی۔ اس سب نے مصطفٰی کمال کو اپنے خیالات کے بارے میں ان کے ساتھ کھل کر بات کرنے کی ترغیب دی۔ لہٰذا، اس نے اپنی حکمت عملی کی وضاحت کی اور اس پر زور دیا کہ ملک کو تباہی کا خطرہ لاحق ہے۔ نیز یہ کہ سلطان کو ذاتی طور پر مسلح افواج پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا چاہیے اور انور اور جرمن کمانڈروں کو تمام اختیارات سے محروم کر دینا چاہیے تاکہ وہ ایک مؤثر آدمی بن سکے نہ کہ صرف برائے نام سلطان۔ اس نے ہائی کمان کی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے اپنی تیاری کی بھی تصدیق کی، تاکہ عثمانی ریاست کو اس بحران سے بچا لیا جائے جس کے دھانے پر وہ کھڑی تھی۔ مصطفٰی کمال نے ان سے یہ بھی کہا کہ انہیں جرمن اتحاد سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے اور اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے یکطرفہ امن معاہدہ کر لینا چاہیے۔

اس پر وحید الدین نے اس سے پوچھا: کیا اور بھی کوئی افسر ہیں جو آپ جیسے خیالات رکھتے ہیں؟ مصطفیٰ کمال نے جواب دیا: ہاں جی، بہت ہیں۔ تاہم وحید الدین نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ چنانچہ اس نے دوسری مرتبہ ملاقات کی لیکن پھر بھی وحید الدین نے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ وہ ان سے تیسری بار ملا اور ایک بار پھر اس نے ان سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ وحید الدین خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے یہاں تک کہ اس نے اپنی بات ختم کی۔ پھر وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے اور سخت اور فیصلہ کن لہجے میں کہا: میں نے اپنے تمام امور قابل احترام انور پاشا اور طلعت پاشا کے ساتھ مل کر ترتیب دیے ہیں۔ پھر انہوں نے فوراً اسے برخواست کر دیا۔

دو ہفتے سے بھی کم عرصہ بعد وحید الدین نے مصطفیٰ کمال کو طلب کیا تو وہ حاضر ہوا۔ سلطان کو اس کے عملہ اور کچھ جرمن کمانڈروں نے گھیر رکھا تھا۔ گرمجوشی سے سلام کرنے کے بعد، وہ ان سب کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا: "یہ مصطفیٰ کمال پاشا ہیں۔ یہ سب سے قابل افسر ہیں جن پر مجھے بھروسہ ہے"۔ اس کے بعد وہ مصطفیٰ کمال کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: "عالی جناب، میں نے آپ کو شام کے محاذ کا کمانڈر مقرر کیا ہے۔ یہ بہت بڑی تزویراتی اہمیت کا حامل ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ فوری طور پر وہاں جائیں۔ اسے دشمن کے ہاتھوں میں جانے نہ دینا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کام کو پورا کر لیں گے اور میں اسے آپ کے سپرد کر رہا ہوں تاکہ اسے بہترین طریقے سے اور کمال کے قریب ترین طریقے سے انجام دیں"۔ پھر اس نے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر فوراً وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔

مصطفیٰ کمال کا شام خالی کر کے برطانیہ کے آگے ہتھیار ڈالنا:

جہاں تک چوتھے واقعے کا تعلق ہے تو اس کی عکاسی اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ جب مصطفیٰ کمال نے برطانیہ سے لڑنے کے لیے شام کے محاذ پر سفر کیا تو اس نے ملک کو ان کے حوالے کر دیا اور اناطولیہ (Anatolia) تک پیچھے ہٹ آیا۔ اپنے لیے احکامات موصول ہونے کے بعد، اس نے شام کے محاذ میں اپنے ہیڈ کوارٹر تک سفر کیا اور اگست 1918 کے آخر میں وہاں پہنچا اور جرمن ہائی کمانڈر لیمان وون سینڈرز (Liman von Sanders) کو رپورٹ کیا، کیونکہ فیلکن ہائن موسم بہار میں پہلے ہی جرمنی واپس آچکا تھا۔ وون سینڈرز نے اسے گرمجوشی سے سلام

کیا، کیونکہ وہ اسے انا فورٹا(Ana Forta) کے دنوں سے جانتا تھا، اور اس نے اسے ساتویں فوج کی کمان سونپی جو دفاعی لائن کے درمیانی حصے پر حاوی تھی۔ محاذ پر فوج کی کمان سنبھالنے کے بعد اس نے گردے کی تکلیف کی شکایت کی اور وہ یکم ستمبر 1918 سے نابلس کے کمانڈ سینٹر میں بستر پر پڑا رہا۔ 19 ستمبر کو محاذ پر برطانیہ کا حملہ شروع ہوا تو مصطفی کمال اپنی فوج کے ساتھ دریائے اردن تک واپس آگیا۔ اس کے بعد اپنی فوج کے ہمراہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے دریا کو عبور کیا اور اپنی فوجیں جمع کیں اور بغیر رکے صحرا کی طرف روانہ ہو گیا، یہاں تک کہ وہ دمشق پہنچ گئے۔

دمشق میں، ہائی کمانڈر وون سینڈرز(von Sanders) نے 27 ستمبر کو اسے ریاق میں ایک نئی دفاعی لائن قائم کرنے کا حکم دیا، تو وہ اس کام کو پورا کرنے کے لیے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ لیمان وون سینڈرز کے پاس واپس گیا اور اسے بتایا کہ ریاق میں دفاعی لائن کو منظم کرنا بیکار ہو گا اور فوجیوں کی تنظیم کے لیے کافی وقت درکار ہو گا۔ اس نے یہ بھی تجویز کیا کہ فوج کو حلب کی طرف مزید 100 میل پیچھے ہٹنا چاہیے اور پورے شام کو ترک کر دینا چاہیے، تاکہ وہ خود ترکی کی طرف آنے والا راستہ آگے بڑھنے والے دشمنوں کے لیے روک سکے۔

جب اس نے یہ رائے تجویز کی تو جرمن کمانڈر نے اس سے کہا: ''میں اس طرح کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا حکم جاری نہیں کر سکتا اور میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ میں سلطنت عثمانیہ کے ایک بڑے علاقے کو آخری حربہ آزمائے بغیر دشمن کے لیے آسان شکار بنا کر چھوڑ دوں۔" اس پر مصطفی کمال نے کہا: ''میں پوری ذمہ داری لیتا ہوں"۔ اس کے بعد اس نے دشمن کے ساتھ تمام محاذ آرائی کو فوری طور پر ختم کرنے اور ترکی کے اپنے دفاع کے لیے حلب کی طرف عام انخلاء کی تیاری کرنے کا حکم جاری کیا۔ پھر وہ حلب کی طرف روانہ ہوا اور 6 اکتوبر کو وہاں پہنچا۔

اس دوران عرب سربراہوں نے، برطانوی انٹیلی جنس افسر لارنس کے ابھارنے پر مصطفی کمال سے کہا کہ وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے حکومت کو اتحادیوں کے ساتھ یکطرفہ امن معاہدہ کرنے پر آمادہ کرے۔

اسی دوران مصطفیٰ کمال کے حلب پہنچنے کے بعد اسکندرون(Iskandaron) کی خلیج میں برطانوی جنگی جہازوں کی نقل و حرکت تیز ہو گئی اور 14 اکتوبر کو تین تارپیڈو کشتیاں خلیج میں داخل ہوئیں۔ کشتیوں میں سے ایک نے سفید جھنڈا لہرایا اور اس سے ایک چھوٹی کشتی اتری جو برطانیہ اور فرانس کے متعدد افسران کو ساحل پر لے گئی جہاں وہ ترک گیریژن کے کمانڈر سے ملے اور پھر واپس آ گئے۔ پھر تارپیڈو کشتیاں خلیج سے چلی گئیں۔

مزید برآں، ایک بار جب مصطفیٰ کمال نے حلب کے شمال میں دس میل کے فاصلے پر دفاعی لائن قائم کی تو اس نے سلطان کو ایک ٹیلی گرام بھیجا جس میں اس نے عزت پاشا کو حکومت کی سربراہی کرنے کے لیے سفارش کی، اور اس نے ایک نئی حکومت کی تشکیل کی تجویز دی جو ان افراد پر مشتمل ہو جن کے نام اس نے اپنے ٹیلی گرام میں درج کیے تھے اور ساتھ ہی کہا تھا کہ وزارت جنگ کا قلمدان اسے دے دیا جائے، یوں اسے پوری ترک فوج پر مکمل کمانڈ حاصل ہو جائے گی۔

اسے سلطان کی طرف سے اپنے ٹیلی گرام کا کوئی جواب نہیں ملا۔ تاہم، اس کے فوراً بعد اسے خبر پہنچی کہ انور اور طلعت اپنے عہدوں سے ہٹ چکے ہیں اور عزت پاشا کو حکومت کا سربراہ مقرر کر دیا گیا ہے، اور یہ بھی کہ نئی حکومت کے ارکان وہی ہیں جن کا اس نے اپنے ٹیلی گرام میں ذکر کیا تھا۔ عزت پاشا نے اسے ایک ذاتی ٹیلی گرام بھی بھیجا جس میں اس نے کہا: "ان شاءاللہ، مجھے امید ہے کہ جنگ بندی کی شرائط پر دستخط ہو جانے تک ہم دوست بن کر مل سکیں گے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصطفیٰ کمال جنگ کے ارادے سے نہیں بلکہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی وسیلے کی تلاش میں شام گیا تھا جب وہ سلطان وحید الدین کو اپنے منصوبے پر آمادہ کرنے میں ناکام ہو گیا تھا اور ایک بار اسے محاذ پر جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ بیماری کے بہانے نابلس میں اس کا قیام، پھر دمشق کی طرف تیزی سے واپسی، شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے۔ جہاں تک پورے شام سے اس کے انخلاء کا تعلق ہے تاکہ اسے برطانیہ کے لیے آسان شکار بنا کر چھوڑ دے اور جنرل کمانڈر کے حکم کی خلاف ورزی کرے، یہ ممکن ہے کہ اس نے یہ سب برطانیہ کے ساتھ

مل کر کیا ہو۔اس کی تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اس نے لارنس کے ساتھ عرب سربراہوں کے ذریعے رابطہ قائم کیا تھا جنہوں نے اسے اپنی حکومت کو جنگ سے دستبردار ہونے اور یکطرفہ امن معاہدہ کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔اس حقیقت کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے کہا کہ وہ ترکی کے دفاع کے لیے حلب میں ایک لائن آف ڈیفنس قائم کرنا چاہتا ہے لیکن بعد میں اس نے اس منصوبے سے پشت پھیر لی اور اپنے ساتھ صرف ترک فوجیوں کو لے گیا۔اس کی تائید اس ٹیلیگرام سے بھی ہوتی ہے جو اس نے وحید الدین کو بھیجا تھا،اور آخر کار عزت پاشا کی طرف سے اسے موصول ہونے والے ذاتی جواب سے اور اس ٹیلیگرام میں اس کے یہ کہنے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے: "مجھے امید ہے کہ جنگ بندی کی شرائط پر دستخط ہو جانے تک ہم دوست بن کر مل سکیں گے"۔

دولت عثمانیہ کا شکست کھانا

اس دوران انور، جو ریاست پر غلبہ رکھتا تھا، کوشش کر رہا تھا کہ وہ باقی ماندہ فوجیوں کو اکٹھا کرے جو اپنی بہت سی لڑائیوں میں فتح یاب ہوئی تھیں، اور ان فوجیوں کو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طور پر دارالحکومت واپس آنے کا حکم دیں۔ لیکن اس کے آس پاس کے لوگوں کا خیال تھا کہ وقت پہلے ہی گزر چکا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جو ماضی میں اس کی حمایت کرتے تھے انہوں نے بھی اس کے ساتھ چلنے اور اس کی پالیسی پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا، وہ ہتھیار ڈالنے اور جنگ بندی کا اعلان کرنے پر مجبور ہوا۔ اس طرح اتحادیوں نے مان لیا اور اس نے جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ جو کچھ رہ گیا تھا وہ جنگ بندی کی شرائط پر مذاکرات کے لیے تھا۔ سلطنت عثمانیہ نے ہتھیار ڈال دیے اور اتحادیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔

تاہم، اس ہتھیار ڈالنے اور اتحادیوں کی جانب سے ریاست پر قبضے کا مطلب اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا نہیں تھا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ ریاست ان کی کوئی کالونی یا ان کی جائیداد بن گئی ہے۔ اور نہ ہی اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کا قبضہ مستقل تھا، کیونکہ یہ دو ریاستوں کے درمیان جنگ تھی، ایک ریاست دوسری پر فتح حاصل کرے گی، اس طرح فاتح ریاست شکست کھانے والی ریاست پر اپنی مرضی کے مطابق امن کی شرائط عائد کرے گی، اور شکست خوردہ ریاست ایک ریاست کے طور پر اپنا ایک وجود برقرار رکھے گی جس کو داخلی اور خارجی طور پر خودمختاری حاصل ہو گی۔ جب کہ دوسری طرف یہ ہتھیار ڈالنا ترکی کی ریاست کی جانب سے ہتھیار ڈالنا نہیں تھا، بلکہ مسلمانوں کے خلیفہ کی طرف سے ہتھیار ڈالنا تھا، یا ان کی اپنی اصطلاح کے مطابق سلطنت عثمانیہ کی جانب سے ہتھیار ڈالنا تھا۔ اس لیے شکست خوردہ ریاست خلافت تھی، ترکی کی ریاست نہیں۔ لہٰذا، اتحادیوں کے بین الاقوامی اقدامات، فاتح کی حیثیت سے، اور عثمانی ریاست کے اقدامات، ہارنے والی ریاست کی حیثیت سے، ریاست عثمانیہ سے متعلق اقدامات تھے، دوسرے الفاظ میں یہ ہر اس شخص سے متعلق تھے جو اس کے جھنڈے تلے رہتے تھے یا خلافت کی بیعت۔

برطانیہ کا خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا:

تاہم چونکہ برطانیہ کا مقصد سلطنت عثمانیہ کو اس کے ایک اسلامی ریاست ہونے کی حیثیت سے ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور خلافت کو ختم کرنا تھا، اس لیے وہ اس راستے پر چلے جو اس نتیجہ پر پہنچا۔ اور انہوں نے مغلوب دولت عثمانیہ کے ساتھ نبٹنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ اس سے مختلف تھا جو انہوں نے مغلوب جرمنی کے ساتھ اختیار کیا' باوجود اس کے کہ دونوں ریاستیں جنگ میں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ لڑیں۔ در حقیقت عثمانی ریاست پر اتحادیوں کی فتح جرمنی پر ان کی فتح جیسی ہی تھی، یوں دونوں ریاستوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جانا چاہیے تھا۔ تاہم، برطانیہ نے جرمنی کے ساتھ بین الاقوامی قانون کے مطابق ایک مغلوب ریاست کے طور پر سلوک کیا اور اس کے مطابق سلوک کیا جو ان دو ریاستوں کے درمیان جنگ کے خاتمے کی صورت میں طے پایا تھا، جس میں ایک فاتح اور دوسری مفتوحہ ریاست تھی۔ جہاں تک عثمانی ریاست کا تعلق ہے، اس کے ساتھ مختلف سلوک کیا گیا۔ کیونکہ جنگ ختم ہوتے ہی اس کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا جن میں سے بیشتر پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا اور جنگ کے دوران جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس کے مطابق حصوں میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے فتح شدہ عثمانی ریاست کی سرزمینوں میں ایک بڑا حصہ حاصل کرنے کے لیے اپنے اتحادیوں سے بھی گریز کرنا شروع کر دیا۔ پھر انہوں نے اپنی کوششیں مرکز خلافت پر مرکوز کر دیں تاکہ اس کے خاتمے کو یقینی بنانے کے لیے موزوں ترین اسالیب کو اپنایا جائے۔

حصے بخرے کرنے میں قوم پرستی اور وطن پرستی کو بنیاد بنایا:

جہاں تک خلافت کے حصے بخرے کرنے کا تعلق ہے تو برطانیہ نے جو قوم پرستی اور وطن پرستی کے بیج بوئے تھے' اب ان سے پھل لینے کا وقت آ گیا تھا۔ اُن کے لیے یہ بالکل درست وقت تھا کہ وہ اس چیز کو بنیاد بنا کر خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے کریں' اور در حقیقت انہوں نے ایسا کرنا شروع بھی کر دیا۔ یوں انہوں نے ترک زبان بولنے والے مسلمانوں کے علاقوں کو ایک واحد اکائی بنا دیا اور اپنی براہ راست حکومت اور بے پناہ اثر رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ترک قوم پرستی کی آگ بھڑکائی۔ انہوں نے ترکی کی آزادی کی فکر کو اجاگر کیا یعنی ترکی کی باقی دولت اسلامیہ سے

علیحدگی' یا ان کے مطابق عثمانی سلطنت سے علیحدگی، جبکہ آزادی کے لفظ کو اتحادیوں کے قبضہ سے چھٹکارا پانے کے طور پر استعمال کیا۔ یہ سب باوجود اس بات کے تھا کہ وہ عملی حقیقت جس کی طرف وہ لوگوں کو دھکیل رہے تھے 'وہ ترکی کی ریاست کے باقی تمام علاقوں سے آزادی تھی، یعنی مکمل علیحدگی۔ انہوں نے عربی بولنے والے مسلمانوں کے علاقوں کو بھی بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ اگرچہ برطانیہ نے ان میں سے اکثر علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا پھر بھی انہوں نے ان علاقوں کو ایک اکائی کے طور پر نہیں رکھا۔ بلکہ اُنہوں نے ان علاقوں کو اُن نقشوں کے مطابق الگ الگ اکائیوں میں تبدیل کر دیا، جن نقشوں کو انہوں نے جنگ کے دوران بنایا تھا۔

اس لیے انہوں نے حقیقی طور پر مفتوحہ ریاست کے ٹکڑے کیے اور اس کے ساتھ امن معاہدہ کرنے سے پہلے اور اس سے صلح کی شرائط پر اتفاق کرنے سے پہلے اسے کئی ریاستوں میں تبدیل کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے زمینوں پر قبضہ کرتے ہی انہیں کئی ممالک میں بانٹ دیا اور ان پر اس طرح حکومت کرنا شروع کر دی کہ گویا وہ کئی ریاستیں ہیں جن پر انہوں نے ابھی قبضہ کیا ہے۔ یہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی اور بین الاقوامی کنونشنز کے خلاف تھا، کیونکہ فاتح ریاست کی جانب سے مفتوحہ ریاست کی سرزمین پر قبضہ مقبوضہ ریاست یا مقبوضہ علاقوں کی قسمت کا تعین کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جو چیز اس کا تعین کرتی ہے وہ امن معاہدہ ہے، چاہے اس معاہدے کی شرائط زبردستی تھوپی ہی کیوں نہ گئیں ہوں۔ اس کی قریب ترین مثال یہ ہے کہ اگرچہ برلن پر چالیس سال سے زیادہ کا قبضہ رہا لیکن اس کی قسمت کا تعین اس کے قبضے سے نہیں بلکہ امن معاہدے اور اس پر اتحادیوں کے اتفاق سے ہوا۔

لہٰذا، سلطنت عثمانیہ کو اس کی زمینوں پر قبضے کے فوراً بعد اور جنگ میں شکست کے فوراً بعد تقسیم کر کے، برطانیہ نے ایک باطل فعل کا ارتکاب کیا اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کی۔ کیونکہ اس نے اتحادیوں کے ساتھ شرائط پر اتفاق کرنے سے پہلے اور امن معاہدے پر دستخط کرنے یا امن کی شرائط پر اتفاق کرنے سے پہلے یکطرفہ طور پر یہ کارروائی کی تھی اور اس سے پہلے کہ اتحادیوں کی طرف سے شرائط طے کی جاتیں، یہ تصور کرتے ہوئے کہ اس کی اپنی طے کردہ شرائط درست ہیں۔

درحقیقت یہ تمام ممالک ریاست کا حصہ تھے، لبنان، شام، عراق، فلسطین، مشرقی اردن، حجاز اور یمن سب کے سب سلطنت عثمانیہ کے جھنڈے تلے اور اس کی ولایات میں سے تھے۔ ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں تھی، نہ اپنی حکومت اور نہ اپنی ریاست، اور ان میں سے کسی کی بھی کوئی الگ خود مختاری (sovereignty) نہیں تھی، خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی۔ اس لیے، اس کے کسی باشندے کو بین الاقوامی مذاکرات کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ ان ولایات کے کسی بھی فرد کی طرف سے کسی بھی ریاست کے ساتھ کوئی بھی بین الاقوامی عمل یا قرارداد باطل قرار پائے گی اور اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اس پر کوئی غور نہیں کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ مصر جو برطانوی تسلط اور برطانوی مینڈیٹ کے تحت تھا، اس کو بھی عثمانی ریاست کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ جب اس کے لوگ، مصری عوام، انگریزوں سے نکلنے کا مطالبہ کر رہے تھے، وہ اسلامی ریاست، عثمانی ریاست کے جھنڈے تلے اپنے ملک کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے، تاکہ وہ ایک بار پھر خلیفۃ المسلمین کی حکمرانی میں آجائیں۔ مصطفی کمال نے بھی انگریزوں کی جلاوطنی اور مصر کو استنبول میں خلافت کے تابع کرنے کیلئے واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔

اس لیے فاتح اتحادیوں کے درمیان ان زمینوں سے متعلق کسی بھی معاملے پر مذاکرات خلیفہ کے ساتھ کیے جانے چاہیے تھے نہ کہ استنبول میں مرکزی حکومت کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ۔ جہاں تک الشریف حسین ابن علی کا تعلق ہے تو وہ خلافت سے وابستہ تھا اور پھر اس نے بغاوت کر دی تھی۔ اس کی بغاوت سے اسے ریاست کا کوئی حق نہیں ملنا چاہیے تھا۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے جنہیں برطانیہ اور فرانس نے دمشق، بیروت اور بغداد میں عرب سربراہوں کے طور پر تسلیم کیا تھے، وہ الحسین کی طرح غدار تھے اور ان کے پاس ایسی کوئی اہلیت نہیں تھی کہ انہیں فاتح اتحادیوں سے مذاکرات کا حق دیا جاتا۔ بلکہ وہ الحسین سے بھی کم قابل تھے، نہ صرف اپنے اثر ورسوخ کے لحاظ سے، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ریاست، جس کے وہ شہری تھے، انہیں کس نظر سے دیکھتی تھی۔ الشریف حسین کو مغلوب (عثمانی) ریاست کی طرف سے حجاز پر شریف سمجھا جاتا تھا، جب کہ یہ سب افراد اپنی امت اور اپنی ریاست سے غداری کرنے والے اور دشمنوں کے جاسوس کے طور پر کام کرنے والے افراد کے سوا کچھ نہیں تھے۔

لیکن برطانیہ نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مقبوضہ علاقوں کے لوگوں کے ساتھ ان کے شہروں کے مستقبل اوران کے انجام سے متعلق مذاکرات کرنے شروع کئے، یہ اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کہ ان مذاکرات کی عالمی سطح پر کوئی اہمیت نہ تھی، نہ ہی انہیں مانا جاسکتا تھااور نہ ہی انہیں کسی شمار میں لایا جاسکتا تھا۔تاہم برطانیہ نے ان کے ساتھ باقاعدہ مذاکرات کئے اور انہیں یہ حق دیا کہ وہ اپنی ریاستوں کی طرف سے قابض ملک کے ساتھ بات کریں۔اس نے اس طریقہ کار کو مقبوضہ علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا،اس منصوبہ کے مطابق جو اس نے ان کے بارے میں بنایا تھااور ان نقشوں کے تحت جو اُس نے ان علاقوں کو تقسیم کرنے کے لیے تشکیل کیے تھے۔اُس نے باضابطہ طور پر عالمی مذاکرات کا معاملہ خلیفہ پر چھوڑ دیا، تاکہ وہ خود کھل کر سامنے نہ آسکے، کیونکہ اُس کا منصوبہ عملی طور پر مکمل اُس وقت ہونا تھا جب صلح کا معاہدہ منعقد ہوتا اور خلیفہ سے اپنی مرضی کی شرائط طے کی جاتیں ۔ کیونکہ اگر وہ اس کو ختم کرنے میں کامیاب نہ بھی ہوا تو جو بھی اُس کا قائم مقام بنے گا اُس کے لئے خلافت کا خاتمہ ممکن ہو۔اسی بنیاد پر اور اس باطل تصرف کے ساتھ برطانیہ آگے بڑھا۔ لہٰذا، برطانیہ کی جانب سے دولت اسلامیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔

یہ سب تو برطانیہ کا مقبوضہ علاقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے اعتبار سے تھا۔ جہاں تک اس کا اتحادیوں سے گریز کرنے کا معاملہ ہے، اگرچہ اس کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں، لیکن ان حربوں کو برطانیہ نے ایک اسلوب کے طور پر استعمال کیا تاکہ خلافت کو ختم کرنے اور اسے تباہ کرنے کے لیے مختلف اقدامات کرنے میں ان کی مدد کی جاسکے۔ اس لیے برطانوی سیاسی چالوں کو سمجھنے کے لیے ان اقدامات کی طرف توجہ مبذول کروانا ناگزیر ہے۔

اتحادی مختلف مقاصد کے لیے جنگ میں داخل ہوئے، اور اگرچہ وہ ایک ہی طرف سے لڑے، تاہم وہ ایک دوسرے سے متصادم، ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے والے اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے تھے۔ ہر ریاست ایک دوسرے کے خلاف خفیہ منصوبہ بندی کرتی تھی۔ برطانیہ اس وقت بین الاقوامی منظر نامے پر صف اول کی طاقت تھا، جبکہ فرانس، روس، جرمنی اور اٹلی اس کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے۔جب وہ جرمنی اور عثمانی ریاست کے

خلاف جنگ میں داخل ہوئی تو اس نے دوسرے ممالک کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ جنگ میں اس کے ساتھ حصہ لیں یا کم از کم جنگ کے خاتمے تک اس سے دستبردار رہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ بڑی طاقتوں کے ساتھ خفیہ سودے کرتی تھی تاکہ ان کو مال غنیمت کا لالچ دلایا جا سکے جسے وہ فتح حاصل کرنے کے بعد آپس میں بانٹ سکیں گے۔ چنانچہ اس نے 26 اپریل 1915 کو لندن میں طے پانے والے خفیہ معاہدے میں اٹلی سے وعدہ کیا کہ اسے ترکی کا ضلع انطالیہ اور بحیرہ روم کے اطراف کے اضلاع جنگ میں شامل ہونے کے بدلے میں انعام کے طور پر دیے جائیں گے۔

ایک سال بعد 1916 میں، برطانیہ، فرانس اور روس نے سلطنت عثمانیہ کو تقسیم کرنے کے لیے خفیہ سائیکس-پکوٹ (Sykes-Picot) معاہدے پر اتفاق کیا۔ اس معاہدے کی بنیاد پر ہی بعد میں مصطفیٰ کمال کے ساتھ امن کی شرائط طے پائی گئیں۔ تاہم، یہ خفیہ معاہدہ اٹلی پر ظاہر نہیں کیا گیا تھا، جسے اس وقت تک اندھیرے میں رکھا گیا جب تک کہ اسے ہوا نہ مل گئی۔ اس طرح اٹلی غصے میں آ گیا اور مال غنیمت کی تقسیم اور سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے کرنے کا مطالبہ کرنے لگا۔

27 اپریل 1917 کو برطانیہ، فرانس اور روس نے ایک معاہدے پر دستخط کرنے میں حصہ لیا جس کا مسودہ انہوں نے خود تیار کیا تھا۔ معاہدہ میں اٹلی سے ضلع ازمیر اور کونیا (Konya) تک اناطولیہ (Anatolia) کے تمام مغربی حصے کا وعدہ کیا گیا تھا، بشرطیکہ ان املاک پر اطالوی (Italian) مینڈیٹ کی حکومت ہو۔ اس معاہدے میں دیگر شقیں بھی شامل تھیں۔ جنگ ختم ہوتے ہی برطانیہ استنبول اور تمام عربی بولنے والے علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے دوڑ پڑا۔ دوسری طرف فرانس نے اس پر قبضہ کرنے کے لیے دوڑ لگائی جس پر انہوں نے اتفاق کیا تھا، چنانچہ اس نے لبنان پر قبضہ کر لیا، اور برطانیہ نے اسے شام پر قبضے سے روکنے کی کوشش کی، حالانکہ فرانس 1920 میں اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

1919 میں، اٹلی نے انطالیہ (Antalya) شہر اور اس کے آس پاس کی املاک پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ برطانیہ نے اس پر اپنی آنکھیں بند رکھیں تاہم اس نے ازمیر (Izmir) پر اٹلی کے قبضے پر اعتراض کیا۔ اس نے فرانس

کے ساتھ مل کر اٹلی کا مقابلہ کیا اور اسے ازمیر اور اناطولیہ (Anatolia) کی مغربی ساحلی پٹی پر قبضہ کرنے سے روک دیا، اس بہانے سے کہ اٹلی کو ان کالونیوں کو دینے کے معاہدے پر روس نے دستخط نہیں کیے تھے۔ اس لیے برطانیہ اور فرانس نے اس معاہدے کو کالعدم قرار دیا۔ اٹلی کے خلاف مزاحمت کرنے کے لیے، برطانیہ نے اتحادیوں کی جانب سے یونان کو ازمیر پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس نے بہت سارے ہتھکنڈوں کا آغاز کیا جو چار سال تک جاری رہے یہاں تک کہ وہ اپنی مطلوبہ تمام چیزوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، یعنی ایک بڑا حصہ حاصل کر لینا، خلافت کو ختم کرنا اور اسلام کو بین الاقوامی میدان میں ایک جان لیوا دھچکا لگانا۔ آخر کار اس نے دوسری لوزان کانفرنس کا انعقاد کیا اور وہ حاصل کیا جو اس نے بین الاقوامی سطح پر حاصل کرنے کے لیے طے کیا تھا۔

خلافت کے خاتمہ کیلئے برطانیہ کا دار الخلافہ پر توجہ کو مرکوز کرنا:

جہاں تک خلافت کے مرکز پر اپنی کوششوں کو مرتکز کرنے کا تعلق ہے تا کہ ان اسالیب کو اپنایا جائے جو اس کے خاتمے کا باعث بنیں، برطانیہ نے اپنے اتحادیوں کے خلاف چالبازیوں کے ساتھ ساتھ اور جن سرزمینوں پر اس نے قبضہ کیا تھا ان پر اپنی کوششیں جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ، اپنی تمام تر توجہ بالخصوص ترکی پر اور اس سے بھی بڑھ کر مرکز خلافت پر مرکوز کی۔ لہٰذا، جنگ بندی کے اعلان کے فوراً بعد، برطانوی جنگی بحری جہاز باسفورس پر قبضہ کرنے کے لیے دوڑ پڑے اور ان کی فوجوں نے دارالحکومت اور دردنیل (Dardanelles) کے تمام قلعوں کے ساتھ ساتھ ترکی بھر کے تمام حساس فوجی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران فرانسیسی فوجیوں نے غلطہ (Antep) پر قبضہ کر لیا، جب کہ اطالوی (Italian) فوجیوں نے بیرا (Bira) اور ریلوے لائنوں پر قبضہ کر لیا۔ برطانوی کمانڈر ہیرنگٹن (Harrington) کو ترکی میں اتحادیوں کا جنرل کمانڈر مقرر کیا گیا۔

اس لیے یہ برطانوی فوجی ہی تھے جنہوں نے دراصل ترکی پر قبضہ کیا اور اس پر اپنا تسلط قائم کیا۔ فرانس اور اٹلی کا قبضہ محض برائے نام اور محض اپنی موجودگی کی تصدیق کے لیے تھا۔ لہٰذا، فتح شدہ ریاست، ترکی کے اندرونی معاملات سے متعلق ترکی کے اور اتحادیوں کے درمیان رابطے کا مطلب دراصل برطانیہ سے رابطہ تھا۔ اس طرح

برطانیہ اکیلے ہی ترکی میں اپنا کردار ادا کرنے میں کامیاب رہا اور ان کے اتحادیوں کا ترکی کے اندرونی معاملات پر کوئی کردار اور کوئی اثر نہیں تھا۔

اب چونکہ جنگ بندی کا اعلان ہو چکا تھا تو انہوں نے ریاست خلافت، یا ان کے مطابق سلطنت عثمانیہ کو کنٹرول کرنے کے لیے بہت سی سیاسی تدابیر بھی شروع کیں۔ انہوں نے اپنے سیاسی کھیل کو خاص طور پر ترکی پر مرکوز رکھا تاکہ اس کی حکومت کا تختہ الٹا جا سکے اور خلافت کو تباہ کیا جا سکے۔

اس مقصد کے لیے، برطانیہ نے جنگ بندی کا اعلان ہوتے ہی ریاست کو سیاسی بحران میں ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے عثمانی ریاست سے جنگ بندی قبول کی اور انہوں نے طلعت اور انور کے ساتھ اس کے معاہدے پر دستخط کیے، لیکن جب ان سے شرائط پر اتفاق کرنے کے لیے مذاکرات کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے اعلان کیا کہ وہ طلعت اور انور کے ساتھ بات چیت کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو جنگ میں عثمانی ریاست کے داخلے کے لیے بنیادی طور پر ذمہ دار تھے۔ اس طرح انہوں نے نئی حکومت کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔

وہ ٹیلی گرام جو مصطفیٰ کمال نے حلب (Aleppo) سے بھیجا تھا اور جس میں اس نے مارشل عزت پاشا کو وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کی سفارش کی تھی، وہ اس وقت پہنچا۔ چنانچہ عزت پاشا نے حکومت بنائی اور اس نے اپنا خصوصی ٹیلی گرام مصطفیٰ کمال کو بھیجا جس میں اس نے لکھا: "مجھے امید ہے کہ جنگ بندی کی شرائط پوری ہونے کے بعد ہم دوست بن کر مل سکیں گے۔" یہ بات قابل غور ہے کہ مصطفیٰ کمال اور اتحادیوں کی طرف سے بیک وقت اور ایک ہی موضوع پر ایسا ہونا سراسر اتفاق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم، اس کے بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ اتفاق کا امکان بہت دور تھا۔

اس کے باوجود عزت پاشا نے مذاکرات کا آغاز کیا تاکہ امن کی شرائط طے کی جا سکیں۔ مروجہ رائے یہ تھی کہ اگر فوری طور پر یکطرفہ امن معاہدے پر دستخط کر دیے جائیں تو ملک بھاری نقصان اٹھائے بغیر اس تعطل سے بچ سکتا ہے جس میں وہ خود پا رہا تھا۔ کچھ لوگ برطانیہ کے بارے میں اچھا سوچتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ان کی مدد کرے گا اور ریاست

عثمانیہ کے جنگ سے نکل جانے اور اس کے ایک غیر جانبدار ریاست ہو جانے سے مطمئن ہو گا۔ اس طرح انہوں نے اتحادیوں کی پیش قدمی کو روکنے اور انہیں دردنیل Dardanelles پر قبضہ کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے برطانوی جنرل ٹاؤن سینڈ (Townsend) کی ثالثی کی کوشش کی جو کہ کوت العمارہ (Kut-Al-Imara) میں قید تھا تاکہ وہ برطانوی بحری بیڑے کے سپہ سالار کالتھورپ (Colthorpe) کو قائل کرے، جو کہ دردنیل کے جزیرہ مودرس (Modres) کی بندرگاہ میں داخل ہو چکا تھا، کہ وہ اپنی پیش قدمی روک دے تاوقتیکہ کہ اتحادیوں کے ساتھ مذاکرات مکمل ہو جائیں۔ اس نے ان کی درخواست کو مسترد کر دیا اور برطانیہ سے تمام امیدیں کھو جانے کے بعد وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

مذاکرات عجلت میں جنگی بحری جہاز سپر (Super) پر ہوئے جس میں ایڈمرل کولتھورپ سوار تھا، اور اتحادی فرانسیسی افواج سے بھی مشورہ کرنے کا وقت نہیں دیا گیا۔ اس طرح برطانیہ نے اتحادیوں کی طرف سے اکیلے ہی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ جنگ بندی کی اور 30 اکتوبر 1918 کو معاہدہ طے پایا۔ پھر برطانیہ نے اپنے اتحادی فرانسیسیوں کو آگاہ کیا، لیکن یہ اس کے بعد ہوا جب انہوں نے ترکی کے زیادہ تر اہم علاقوں پر باقاعدہ قبضہ کر لیا، جبکہ اور فرانس اور اٹلی کے لیے برائے نام قبضہ چھوڑا، اس لیے کہ انہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا۔

جنگ بندی کے صرف ایک ماہ بعد، برطانیہ نے خلیفہ کو حکم دیا کہ عزت پاشا کو حکومت سے ہٹا کر نئی حکومت تشکیل دی جائے، کیونکہ وہ حکومت طلعت اور انور کے فیصلے کی ذمہ دار تھی، جنہیں گرفتار کر کے اتحادیوں کے حوالے کیا جانا چاہیے تھا، جیسا کہ جنگ بندی کی شرائط میں ایک شق کے طور پر یہ کہا گیا ہے کہ جنگ کے ذمہ داران کو حوالے کیا جائے گا۔ اس طرح برطانیہ نے خلافت کے لیے سیاسی بحرانوں کے ایک سلسلہ کا آغاز کیا۔

خلافت کو سیاسی اور قانونی اقدامات کے ذریعہ ختم کرنے کی برطانوی کوشش

ایسا لگتا تھا کہ برطانیہ کسی فوجی بغاوت یا مسلح بغاوت کا سہارا لیے بغیر، خلافت کو تباہ کر کے اور جائز اور قانونی طریقوں سے جمہوریہ کے قیام کے ذریعے، حکمرانی کے نظام میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کرنے کی امید کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے خالصتاً سیاسی اسالیب کا سہارا لیا۔ ایک بار جب عزت پاشا کو ہٹا دیا گیا تو خلیفہ نے توفیق پاشا کو نئی حکومت بنانے کی ہدایت کی۔ توفیق پاشا کو برطانوی ایجنٹ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ عبد الحمید کے دور میں وہ ایک سرکاری ملازم تھا، جسے لندن میں عثمانی ریاست کا سفیر مقرر کیا گیا، جہاں وہ برطانیہ کی ہمدردی اور خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ تاہم، جب اس نے اپنی حکومت بنائی تو وہ اپنی عمر کی اسی کی دہائی کا بوڑھا شخص تھا اور توقع کے مطابق اپنا کردار ادا کرنے کے لیے قابل نہ تھا۔ اس لیے برطانیہ اس کی حکومت کے قیام سے بے چین تھا۔

تاہم، اس کو تبدیل کرنے اور نئی حکومت لانے کی کوشش کرنے سے پہلے، وہ پارلیمنٹ کو تحلیل کرنا چاہتے تھے جسے "مجلس المعبوثان" کہا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کونسل کو تمام عثمانی ریاست یعنی ریاست خلافت کے لوگوں نے منتخب کیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ترکی کی پارلیمنٹ نہیں تھی جو بالخصوص ترکی کے لیے تھی۔ اس کے علاوہ، زیادہ تر اراکین اسمبلی کا تعلق ینگ ٹرکس (Young Turks) اور کمیٹی آف یونین اینڈ پروگریس (.C.U.P) سے تھا۔ دوسرے الفاظ میں انور اور جمال کی وہ جماعت، جس کے خیالات خلافت اور عثمانی ریاست کے تمام حصوں کو برقرار رکھنے کے حق میں تھے۔ اس لیے اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ وہ خلافت کے خاتمے یا سلطنت کے دیگر حصوں کو ترکی سے الگ کرنے پر راضی ہو۔ وہ ملک میں سیاسی خلاء بھی پیدا کرنا چاہتے تھے اور پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے سے انہیں اس خلا کو پیدا کرنے میں مدد ملتی۔ لہذا، وہ اسے تحلیل کرنے کے لئے پر عزم تھے۔ وہ اپنے مطالبے کے جواب میں سلطان کی مداخلت کا سہارا لیے بغیر سب سے پہلے اسے آئینی طریقوں سے تحلیل کرنا چاہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب مصطفیٰ کمال نے آئینی حل کو لاگو کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ پھر سلطان نے ایک غیر متوقع اقدام

میں ایک حکم نامے کے ذریعے پارلیمنٹ کو تحلیل کر دیا۔ اور یہ صرف اس مطالبے پر مبنی ہو سکتا تھا جس کا وہ قائل تھا یا جس سے انکار کرنے کا وہ متحمل نہ تھا۔

مزید خاص طور پر، توفیق پاشا کے لیے آئینی قواعد کے مطابق پارلیمانی اعتماد کا ووٹ(vote of confidence) حاصل کرنا ناگزیر ہو گیا، اور اس لیے اس ووٹ کو ڈالنے کے لیے پارلیمانی اجلاس منعقد ہونا تھا۔ مصطفیٰ کمال جو ابھی حلب(Aleppo)اور اذانو(Adhano) سے واپس لوٹا تھا، حکومت کو عدم اعتماد کا ووٹ دینے کے لیے اراکین اسمبلی کو راضی کرنے کے لیے پہنچ گیا۔ یونین کے ممبران میں سے اس کے کچھ دوست تھے جو پارلیمنٹ کی اکثریت کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان میں سے ایک فتحی بیک بھی تھا جس کے پاس طاقت اور اثر ورسوخ تھا۔ فتحی بیک نے ان کے لیے متعدد اراکین جمع کیے اور اس نے ایک ملحقہ کمرے میں ان کے ساتھ بحث کا آغاز کیا اور مصطفیٰ کمال نے اپنی تجویز پیش کی کہ حکومت کو عدم اعتماد کا ووٹ دیا جائے۔ تاہم انہوں نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ عدم اعتماد کا ووٹ ڈالنا لامحالہ کونسل کی تحلیل کا باعث بنے گا۔ اس پر وہ اپنے مقاصد کو مزید چھپا نہیں سکتا تھا اس لیے اس نے فوراً جواب دیا: "اور یہ طویل مدت میں بہتر ہو گا، کیونکہ اس کے ذریعے، ہم اپنا وقت گزار سکتے ہیں اور اپنے معاملات کو اپنی مرضی کی حکومت بنانے کے لیے استوار کر سکتے ہیں"۔

اجلاس کے آغاز کی گھنٹی بجی اور پالیمانی نمائندے پارلیمنٹ ہال کی جانب بڑھے۔ لیکن جب ووٹ ڈالنے کا وقت آیا اور سپیکر نے نتائج کا اعلان کیا تو اکثریت نے حکومت کو اعتماد کا ووٹ دیا۔

جب مصطفیٰ کمال کو یہ معلوم ہوا تو وہ پارلیمنٹ کی عمارت سے باہر نکلا اور گھر پہنچتے ہی محل کو ٹیلی فون کر کے سلطان سے فوری ملاقات کی درخواست کی۔ سلطان وحید الدین مصطفیٰ کمال کے افکار سے واقف تھے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے ان کے عزائم کے بارے میں جانتے تھے۔ درحقیقت، انہوں نے اس میں موجود طاقت کو محسوس کیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ فوج میں اس کے طاقتور اتحادی موجود ہیں اور وہ فوج پر اثر ورسوخ رکھتا ہے۔ وحید الدین کی اصل فکر اپنے تخت کو برقرار رکھنا تھی اور وہ مصطفیٰ کمال کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب اس نے اپنے ساتھ حاضرین کی

موجودگی کی درخواست کی تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔ تاہم، انہوں نے ملاقات کی تاریخ قریب ترین جمعہ کو مقرر کی۔ وحید الدین نے اس دن کا انتخاب اس لیے کیا کہ یہ وہ دن تھا جب "سلام الملک" (حکمران کو سلام) ہوتا تھا، یعنی جب خلیفہ ان لوگوں سے ملاقات کرتے تھے جو ان سے ملنے آئے ہوتے تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مصطفی کمال سلطان کے ساتھ اپنے روابط کا اعلان کرے اور اس کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ خلیفہ سے اپنی وفاداری کی تصدیق کرے۔ پھر وہ اس کی گفتگو کو سننے کے لیے مناسب انتظامات کر لیتے، جسے وہ جانتے تھے کہ تنہائی میں ہی ہونا تھی۔

جب نماز ختم ہوئی تو وحید الدین نے مصطفی کمال کو اپنے ساتھ بیٹھک میں جانے کو کہا۔ سلطان جان بوجھ کر ملاقات کو طول دے رہے تھے اور گفتگو میں پورا ایک گھنٹہ لگا۔ سلطان نے مصطفی کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "مجھے پورا یقین ہے کہ فوج کے کمانڈروں اور افسران کو آپ پر بڑا اعتماد ہے، تو کیا آپ مجھے اس بات کی ضمانت دیں گے کہ فوج میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی؟" مصطفی کمال نے جواب دیا: ''عالی جناب، میں مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، لیکن جو کچھ میں اس وقت دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کمانڈروں کو آپ کے تخت سے بغاوت کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، میں آپ کو اس بات کی تصدیق بھی کر سکتا ہوں کہ آپ کے اس خوف کا کوئی جواز نہیں بنتا۔" اس پر سلطان نے کہا کہ میں موجودہ وقت کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مستقبل میں کیا متوقع ہے"۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ مصطفی کمال نے کیا جواب دیا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس نے ان سے اس انداز میں بات کی جس سے انہیں تسلی ہوئی، کیونکہ سلطان نے بعد میں ان سے کہا: "آپ ایک عقلمند کمانڈر ہیں، اور بلاشبہ آپ اپنے ساتھیوں پر اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور انہیں قائل کر سکتے ہیں کہ وہ پر سکون رہیں اور انہیں تلقین کر سکتے ہیں کہ وہ سوچ سمجھ سے کام لیں۔"

اس خصوصی ملاقات نے، جس میں کسی اور نے شرکت نہیں کی، محل میں موجود لوگوں کی توجہ کو جکڑ لیا اور انہوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ یہ آخر کس بارے میں تھی۔ تاہم، خلیفہ نے ملاقات کے روز ہی ایک فرمان جاری کیا جس میں انہوں نے نئے انتخابات کی تاریخ طے کیے بغیر پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم نامے نے سب کو

حیران کر دیا، خاص طور پر کیونکہ یہ ایک من مانا اقدام تھا جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ تحلیل کے لیے کوئی آئینی جواز یا وجوہات نہیں دی گئیں۔اس لیے لوگوں کا خیال تھا کہ مصطفیٰ کمال نے خلیفہ کو پارلیمنٹ تحلیل کرنے کا مشورہ دیا تھا اور ان کے فیصلے پر اثر انداز ہوا تھا، جیسا کہ اس نے کیا بھی تھا۔ یہ خاص طور پر اس لیے تھا جب مصطفیٰ کمال کی طرف سے اراکین کو حکومت کو عدم اعتماد کا ووٹ دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کے تناظر میں سامعین کی درخواست آئی، کیونکہ یہ لامحالہ پارلیمنٹ کی تحلیل کا باعث بنتا۔تاہم، تحلیل کے آس پاس کے واقعات نے تجویز کیا کہ خلیفہ کے فیصلے کا مصطفیٰ کمال کے اثر ورسوخ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ملاقات والے دن ہی ہوا تھا اور اس بات کا نہایت قلیل امکان تھا کہ ایسا ملاقات میں کہی گئی باتوں کے نتیجے میں ہوا ہو، خاص طور پر چونکہ ملاقات جمعہ کے دن تھی، جو کہ عام تعطیل ہے۔اس کے علاوہ مصطفیٰ کمال جنگ بندی پر دستخط اور جنگ کے خاتمے کے بعد پہلی بار سلطان سے مل رہا تھا اور وہ کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو، اس کی درخواست کی تکمیل یوں بجلی کی سی رفتار سے نہیں ہو سکتی تھی۔

لہٰذا واقعات بتاتے ہیں کہ پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کا معاملہ اس ملاقات سے پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا، اور اس کا من مانے انداز میں اعلان کسی شک و شبہ کے بغیر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ ایک ایسے معاملے پر مبنی تھا جو سلطان کے اختیار سے باہر تھا۔ایک شخص اس سے صرف یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ برطانیہ نے ترتیب دیا تھا، کیونکہ وہ قبضے کے ذریعے خلیفہ اور ملک پر براہ راست کنٹرول رکھتے تھے۔

اس کے باوجود پارلیمنٹ کی تحلیل نے پورے ملک میں ایک بڑا ہنگامہ اور انتشار پھیلایا۔افواہیں پھیل گئیں کہ یونینسٹوں (unionists) نے ایشیا مائنر (Asia Minor) میں انقلاب کا اعلان کرنے کے لیے اپنے حامیوں کو مسلح کیا تھا، کیونکہ یہ یونینسٹوں کے لیے ایک مہلک دھچکا تھا۔اس ہنگامہ آرائی کے درمیان، توفیق پاشا غائب ہو گیا اور اس کی جگہ داماد فرید پاشا نے لی جو "انگریز جنٹلمین" (“English Gentleman”) کے نام سے جانا جاتا تھا اور وہ سلطان کا داماد بھی تھا۔

جہاں تک مصطفیٰ کمال کا تعلق ہے، اس نے بیرہ (Bira) کے نواحی علاقے شیلی (Shilly) میں ایک مکان کرائے پر لیا اور وہاں ایک عام فرد کی طرح رہنے لگا۔ اس نے سیاست کو چھوڑ دیا اور خاموشی اختیار کر لی۔ وہ بعض کلبوں میں جاتا اور اونچی سوسائٹی کے لوگوں سے گھلتا ملتا نظر آنے لگا تھا۔ تاہم، وہ بہت محتاط رہا، اس کی گفتگو کسی مخصوص بات کا تقاضا نہیں کرتی تھی اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ سلطان کے ساتھ تھا یا مخالف۔

تاہم، سلطان مصطفیٰ کمال کے ارادوں سے واقف تھا، کیونکہ وہ اس کے خیالات اور اس کے منصوبوں سے واقف تھا۔ اس لیے وہ اس کی شدید مزاحمت کرتا تھا اور اس پر کڑی تنقید کرتا تھا۔ وہ اپنے وفد سے کہا کرتے تھے کہ مصطفیٰ کمال ترکوں کو اس کے خاندان سے الگ کرنا چاہتا ہے اور ان کے اور عوام کے درمیان دشمنی پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ انہیں ہٹا سکے۔ تاہم، مصطفیٰ کمال کی سیاسی سرگرمیوں سے برخواست ہونے نے انہیں اس پر کوئی عذر نہیں دیا۔ بہت سے لوگوں نے مصطفیٰ کمال کے خلاف سلطان کی دشمنی کو ناپسند کیا۔

جب داماد فرید نے حکومت بنالی اور برطانیہ نے اس پر رضامندی ظاہر کر دی تو سلطان کے خوف میں اضافہ ہو گیا اور اس نے سوچا کہ وہ برطانیہ کی مدد کے بغیر اپنا تخت برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ اس طرح وہ داماد فرید میں اپنا ایک بڑا حلیف اور حامی دیکھتے تھے۔ سلطان اور داماد نے برطانیہ کو خوش کرنے کے لیے تمام تر ممکنہ وسائل کو استعمال کیا۔ انہوں نے ایک انجمن (association) قائم کی جس کا نام انہوں نے "برطانیہ کے دوست" ("Friends of Britain") رکھا اور حکومت نے ہر طرح سے اس انجمن کی حمایت کی۔ برطانیہ نے اپنی طرف سے اسے دلکش سونے کے ساتھ مالی امداد فراہم کی۔ تاہم، عام لوگ، اور نوجوانوں اور فوجی افسران کی اکثریت برطانیہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور قابضین کے خلاف بغض رکھتے تھے۔

چنانچہ سلطان اور اس کے وزیر اعظم نے اپنے آپ کو پوری طرح برطانیہ کی آغوش میں ڈال دیا اور ان پر مکمل انحصار کیا۔ اس وقت تک برطانیہ نے ملک کے سیاسی معاملات کو چلانے کے لیے اتحادی افواج کے کمانڈر ان چیف برطانوی جنرل ہیرنگٹن (Harrington) کے ساتھ استنبول میں ایک ہائی کمشنر مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے

سلطان کو اپنی رائے مسلط کرنا شروع کر دی اور اس سے جیسے چاہتے فیصلے کرواتے۔ نتیجتاً سلطان نے حاکم کی حیثیت سے اپنا اختیار کھو دیا اور ایک قیدی کی طرح ہو گیا۔ اصل اختیار اتحادیوں کے ہاتھ میں چلا گیا، یا خاص طور پر اکیلے برطانیہ کے ہاتھ میں، جن کی نمائندگی برطانوی ہائی کمشنر اور جنرل ہیرنگٹن کرتے تھے۔

سیاسی خلا پیدا کرنے کیلئے برطانوی اقدام:

مزید برآں، برطانیہ ملک میں ایک سیاسی خلا پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ خود اسے پر کر سکے۔ ظاہری طور پر، اس نے ملک کے سیاسی معاملات کو اس کے اپنے لوگوں کے چلانے پر چھوڑ دیا جبکہ اپنے ایجنٹوں کو سیاسی سرگرمیاں سرانجام دینے پر زور دیا۔ پھر اس نے پس پردہ ملک میں انتشار اور سیاسی عدم استحکام پیدا کیا، تاکہ مقامی لوگوں کی ملک پر حکومت کرنے کی نااہلی کو اجاگر کیا جا سکے، جس سے سیاسی خلا پیدا ہو گیا۔ خلاء سے مراد یہ ہے کہ ایسی صورتحال جس میں نہ کچھ کیا جا سکے اور نہ اُس پر قائم رہا جا سکے۔ بلکہ دوسرے الفاظ میں طاقت موجود ہو مگر اُس کا بھرپور طریقے اور مکمل صلاحیت سے استعمال نہ ہو سکتا ہو۔

خلاء یا تو سیاسی، فوجی یا تزویراتی (strategic) ہو سکتا ہے۔

سیاسی خلاء اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ریاست غیر مستحکم ہو، غیر منظم ہو اور بے چینی اور سیاسی عدم استحکام میں ڈوب جائے۔ اس صورت میں یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ریاست کو طاقت اور کام کرنے اور قائم رہنے کی صلاحیت دے کر اس خلاء کو پر کیا جائے۔ برطانیہ نے دولت عثمانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو ترکی کے اندر محصور کر دیا اور ریاست کی باقی پالیسیوں اور معاملات میں اُس کی رائے کو ختم کر دیا۔

اس طرح ملک کے اندر سیاسی قوت پیدا ہو گئی 'لیکن انہوں نے ایسے اقدامات کرنے شروع کئے کہ اس قوت کو باصلاحیت اور موزوں طاقت بننے سے روکا جائے تاکہ وہ اس قابل نہ ہو سکے کہ ریاست کی ذمہ داری سنبھالے اور اس

کو مستحکم کرنے پر قادر ہو۔اس لئے انہوں نے پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کا کھیل کھیلا' تاکہ بے چینی اور عدم استحکام پیدا کر سکیں۔

پھر انہوں نے لوگوں کو ایسے سیاسی اقدامات کی طرف متوجہ کیا جس سے بد نظمی اور افراتفری پیدا ہو۔ بلاشبہ، پارلیمنٹ کے تحلیل کیے جانے نے عملی طور پر ہنگامہ اور بے چینی پیدا کی اور لوگ ریاست کی حکومت چلانے سے متعلق نا قابلیت کو محسوس کرنے لگے۔تب مقامی لوگوں کے ایک گروہ نے ملک کو اس صورتحال سے نکالنے کی کوشش کی۔

29 نومبر 1918 کو ڈاکٹر اسعد جو کہ یمنی ڈاکٹر تھا اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا تھا، اس نے دارالخلافہ میں ایک کانفرنس کی دعوت دی جس میں آٹھ بڑی جماعتوں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے شرکت کی تاکہ ملک کے حالات پر غور کریں۔بہت سی نشستیں منعقد کی گئیں لیکن وہ کانفرنس بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہو گئی۔

سابقہ وزراء اور بڑے بڑے نمایاں لوگوں پر مشتمل تیس آدمیوں کا ایک گروہ "الوحدۃ الوطنیہ(The National Unity)" کے نام سے تشکیل دیا گیا۔وہ سابقہ پارلیمنٹ کے سپیکر احمد رضا کے گرد اکٹھے ہو گئے جس نے تنظیم "ترکیا الفتاۃ"(Young Turks Committee) بنائی تھی لیکن یہ گروہ کوئی کامیابی نہ حاصل کر سکا۔یونینسٹ (Unionists) بھی غیر معمولی طور پر سر گرم رہے 'لیکن وہ بھی کوئی کامیابی نہ حاصل کر پائے۔

لہذا، لوگ ایک ریاست کی موجودگی کو محسوس کرتے تھے اور ساتھ ہی، حکومت اور سیاست کا بوجھ اٹھانے میں اس کی نا اہلی کا احساس کرتے تھے۔ وہ لوگ جو سیاست میں کام کرتے تھے، کئی گروہوں اور کئی افراد میں ڈھل گئے۔تاہم ان کے درمیان کوئی نظم اور کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ موثر سیاسی کام کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ سب ناکام ہو گئیں اور ماند پڑ گئیں۔

ملک میں واضح طور پر سیاسی خلاء پیدا ہو گیا تھا جس کو ہر شخص محسوس کر سکتا تھا کیونکہ کوئی ایسی اسمبلی موجود نہ تھی جو اُمت کی نمائندگی کرتی اور سلطان مشورہ کرنے یا نصیحت لینے کے لیے اس سے رجوع کر پاتا، تاکہ نظم و ضبط پیدا کیا جاتا جو سلطان کو اس قابل کرتا کہ وہ ریاست کے امور کی دیکھ بھال کر پاتا اور سیاست کا بوجھ اُٹھا سکتا۔ اور ایسی کوئی حکومت بھی موجود نہ تھی جو اُمت کے ساتھ رابطے میں ہو اور ایسے اقدامات کر رہی ہو جو سیاست دانوں کے اقدامات اور عوام کے ساتھ ہم آہنگ ہوں، اور سیاست کی ذمہ داری اور ریاستی امور کو چلانے کا بوجھ اٹھائے، اور کوئی خلیفہ موجود نہ تھا جو کہ لوگوں کو رائے میں شریک کرتا، کوششوں میں ضبط پیدا کرتا اور سیاسی اقدامات اُٹھاتا۔ پارلیمنٹ تحلیل ہو چکی تھی، حکومت مفلوج ہو گئی تھی اور خلیفہ تقریباً ایک قیدی کی طرح تھا۔ اس لئے سیاسی خلا نمایاں تھا اور یہ خلا ریاست کے کام کرنے اور استحکام لانے کی ناقابلیت ہونے سے ظاہر تھا، اس کے باوجود کہ لوگ ریاست اور حکمرانوں کی موجودگی کو دیکھ رہے تھے۔

بد نظمی، انتشار اور سیاسی عدم استحکام بھی واضح تھا اور بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود مقامی سیاست دان اس سیاسی خلا کو پُر کرنے میں ناکام رہے کیونکہ ان کے درمیان ہم آہنگی نہیں تھی، جو ان کے مختلف نظریات اور مفادات ہونے کی وجہ سے تھی۔ صرف مباحثے اور تقریریں سیاسی وجود پیدا نہیں کر سکتیں اور نہ ہی سیاسی خلا کو پر کر سکتی ہیں، جب تک کہ ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ یہ نتیجہ کہ ریاست کو اپنے بوجھ کو اٹھانے کی طرف لے جایا جائے اور اسے کام کرنے اور مستحکم ہونے کے قابل بنایا جائے، یا حکومت حاصل کی جائے اور پوری ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی جائے یا کام کرنے اور استحکام پیدا کرنے کی صلاحیت کا خود مظاہرہ کیا جائے۔ کچھ حاصل کیے بغیر محض تقریروں اور سیاسی دستاویزات پر قناعت کرنا اور ریاست کو عدم استحکام اور اضطراب کی ایسی حالت میں چھوڑنا، کوشش کا ضیاع ہے اور ایسے ہے جیسے چکی کے گرد گدھے کا گھومتے رہنا۔ اور اس کی ناکامی جلد ہی ظاہر ہو جائے گی۔

اس لیے مقامی سیاست دانوں کی کوششیں اور جماعتوں کی جانب سے کیے گئے اقدامات کا کوئی پھل نہیں نکلا۔ اس خوفناک سیاسی خلا میں نومبر 1918 سے اپریل 1919 کے درمیان چھ ماہ تک جمود برقرار رہا۔

اسی دوران برطانیہ نے ملک میں آزادی کے خیال کو عوام کا حق قرار دیتے ہوئے اکسایا کہ ترکی ترکوں کا ہونا چاہیئے بالکل اسی طرح جیسے امریکہ امریکیوں کا ہے اور یہ کہ ایک جدید ریاست کو جدید بنیادوں اور جدید ستونوں پر قائم کیا جانا چاہیئے۔ انہوں نے اس بات کی حمایت کی کہ جدید ترکی کو عوام کی مرضی پر مبنی ہونا چاہیے، اور عوام کے لیے ہونا چاہیے۔ ایسا ترکی، جسے مکمل اختیار اور مطلق خود مختاری حاصل ہو، اور ایک ایسا ترکی جو سلطان جیسی مضحکہ خیز چیز کو جگہ نہ دے۔

یہ خیالات لوگوں میں خاص طور پر استنبول میں اور نوجوانوں اور فوجی افسروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ برطانیہ کی ان افکار کو پھیلانے اور ان کے لیے حمایت حاصل کرنے کی صلاحیت کو سمجھنے کے لیے اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ جب خلافتِ عثمانیہ موجود تھی تو برطانیہ نے آزادی کی آڑ میں قوم پرستانہ اور علیحدگی پسندانہ رجحانات کو جنم دینے کے حوالے سے کیا حاصل کیا تھا۔ کیونکہ وہ بلقان (Balkans) پر اثر انداز ہونے میں کامیاب رہے یہاں تک کہ انہوں نے بدامنی اور انتشار پیدا کر دیا، جس کی وجہ سے اس کے بہت سے حصے خلافتِ عثمانیہ سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے۔ اس بات کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ انہوں نے عربوں اور ترکوں کے درمیان قوم پرستانہ رجحانات اور آزادی کے جذبات کے ذریعے علیحدگی پسندانہ رجحانات کو بھڑکانے کے لیے کیا کیا، یہاں تک کہ انہوں نے ریاست کے شہریوں کو دو کیمپوں میں تبدیل کر دیا۔ اس وقت ان کے پاس جو ذرائع تھے وہ صرف نعرے اور ان کے ایجنٹ تھے، لیکن ایک شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ ملک پر قابض ہونے کے بعد، ملک کے تمام معاملات کو سنبھالنے کے بعد، سلطان اور اس کے وزرائے اعظم کے ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بن جانے کے بعد جن کو وہ اپنی مرضی سے کنٹرول کر پاتے، وہ کیا کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ اس خیال کو بہت سے لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے بعد مصطفیٰ کمال نے اپنی سرگرمیاں دوبارہ شروع کیں لیکن اس بار انتہائی احتیاط سے اور کسی کی توجہ حاصل کیے بغیر۔ اس وقت بہت سے لوگ اسے سلطان کا دوست سمجھتے تھے اور اس نے اپنی طرف سے کبھی یہ تاثر نہیں دیا کہ وہ حکومت کے خلاف سازش کر رہا ہے یا وہ اس سے ناخوش ہے۔ اس نے اپنی حرکات کو چھپایا اور قبضے کے خلاف

مزاحمت اور ملک کو بچانے کی بنیاد پر ایک گروپ بنانے کی جانب آہستہ آہستہ بڑھا۔ تاہم، اس نے اپنے قریب ترین لوگوں پر اعتماد کیا اور اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ ایک موقع پر اس نے استنبول میں اپنے قریبی لوگوں کو یہ کہہ کر اپنے منصوبے کی وضاحت کی: "حکومت کسی بھی فیصلے تک پہنچنے میں آزاد نہیں ہے اور سلطان فاتحین کے ہاتھ میں ایک قیدی ہونے سے کچھ مختلف نہیں ہے ۔ اس لیے قوم پرست حکومت کا مرکز ملک کے قلب میں اناطولیہ منتقل کیا جائے۔ کیونکہ اناطولیہ میں لوگوں کو قوم پرستی کی تحریک میں ضم ہونے اور حصہ لینے کی ترغیب دی جاسکتی ہے۔ قوم پرست تحریک خطرے سے دوچار سلطان کے تخت کی نجات اور اسے قابضین کے ہاتھوں سے چھڑانے کے لیے راہنمائی کر سکتی ہے۔ یورپ کے لوگوں کے ساتھ تصادم سے بچنے کے لیے تمام کوششیں بروئے کار لائی جانی چاہئیں، کیونکہ جس تحریک کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ پر امن ہے اور جو کام ہم سب سے پہلے کرنا چاہتے ہیں وہ سلطان کو بچانا ہے۔ مجھے داماد فرید پاشا کی حکومت کے بارے میں کہنے کو کوئی اچھا لفظ نہیں مل سکتا۔ اس لیے میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اس حکومت کا تختہ الٹنا بغیر کسی شبہہ کے ایک قوم پرستانہ ضرورت ہے۔"

مصطفیٰ کمال نے اپنی اس خفیہ سرگرمی کو فوج کی جنرل کمان سنبھالنے کی کوشش کے ساتھ جوڑا۔ تاہم، وہ ناکام رہا اور پھر اس نے تمام امیدیں کھو دیں، کیونکہ اسے صاف صاف بتا دیا گیا تھا کہ اس کے پاس مسلح افواج کا جنرل کمانڈر بننے کا کوئی امکان نہیں ہے اور نہ ہی کوئی سرکاری عہدہ سنبھالنے کا۔ اس لیے وہ خاموش رہا اور کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہ کیا۔ وہ خلیفہ اور حکومت کا وفادار ہونے کا دکھاوہ کرتا رہا اور اس نے حامیوں کو اکٹھا کرنے اور آزادی کے نظریہ کو پھیلانے کے علاوہ اور کوئی سرگرمی نہ کی، یہ کہتے ہوئے کہ آزادی پیش کرنے کی بجائے حاصل کی جاتی ہے، اور اسی طرح کے تمام نظریات جو مغرب، بالخصوص برطانیہ پھیلاتا تھا۔

برطانیہ کی سیاسی اور قانونی طریقہ کار میں تبدیلی

مصطفیٰ کمال نے اپنے افکار پھیلانے اور حامیوں کو اکٹھا کرنے کے علاوہ کوئی اور سرگرمی کرنے سے گریز کیا یہاں تک کہ مئی 1919 تک جب اس کی باری آئی اور اتحادیوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک مختلف انداز میں کام شروع کیا، یعنی ترکی کو عثمانی سلطنت کے دوسرے حصوں سے الگ کرنا، ریاست خلافت کو ختم کرنا اور ترک جمہوریہ کا قیام۔ یہ اس وقت ہوا جب سیاسی بحران پیدا کرنے اور اپنے ایجنٹوں کو جائز اور قانونی طریقوں سے اقتدار میں لانے کی ان کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ ان کے اقدامات سیاسی، بین الاقوامی اور انقلابی تھے۔ جس چیز نے انہیں اس بات پر اکسایا وہ تھا اٹلی کا اپنے مال غنیمت کے طور پر سلیشیاء (Cilicia) پر قبضہ۔ لہذا، برطانیہ نے محسوس کیا کہ جب تک وہ ترکی میں رہتے ہوئے اتحادیوں کے خلاف مناسب کارروائی نہیں کرتا، وہ ترکی میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے اور اپنے مخالفین فرانس اور اٹلی کو ترکی کی اسٹریٹجک پوزیشنوں سے ہٹانے میں قابل نہیں ہو سکے گا۔ جب اٹلی نے اپریل 1919 میں انطالیہ (Antalya) شہر اور اس کے آس پاس کی املاک پر قبضہ کر لیا، اور جب اس نے فیوم (Fayum) پر قبضہ کر لیا جو یوگوسلاویہ کا حصہ تھا، تو اس نے اتحادیوں کی جانب سے ازمیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ برطانیہ اور فرانس نے اس کے اقدام کی مخالفت کی اور اس کا مقابلہ کرنے اور اسے ازمیر یا اناطولیہ کے مغربی ساحل پر قبضہ کرنے سے روکنے کا فیصلہ کیا۔ پھر انہوں نے انطالیہ پر اس کے قبضے پر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ اس سے اسے بحیرہ روم کے مشرقی حصے پر کنٹرول مل جائے گا۔ ازمیر اور مغربی ساحلی پٹی پر اٹلی کے قبضے کی توثیق کے سلسلہ میں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور روس کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اسے کالعدم قرار دے دیا گیا کیونکہ روس نے جنگ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے یونان کے لیے ازمیر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

ایک طرف انہوں نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کیا۔ دوسری طرف، برطانیہ نے بیک وقت دعویٰ کیا کہ ایشیا مائنر کے اندر اناطولیہ میں گڑبڑ پھیل گئی ہے، اور ڈکیتی اور لوٹ مار کی وارداتیں بہت عام ہو چکی ہیں اور

یہ تشویشناک رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ سیکورٹی فورسز ملک میں بے مقصد گھوم رہی ہیں، اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ امن وامان کا مشاہدہ کیا جانا چاہئے اور سیکورٹی کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کے لئے ایک سخت طریقہ کار کی ضرورت ہے۔ لہٰذا، برطانیہ نے استنبول میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ مشرقی صوبوں میں ایک مضبوط آدمی کو بھیجے اور اسے امن وامان کی بحالی اور حکومت کی اتھارٹی کو دوبارہ قائم کرنے کا کام سونپا جائے۔

انہوں نے غیر سرکاری طور پر مصطفیٰ کمال کو یہ ذمہ داری سنبھالنے کی سفارش بھی کی۔ اس معاملے پر وزارت جنگ سے رابطہ کیا گیا اور وزارت جنگ کے سینئر مشیر جواد پاشا نے اس کی منظوری دی۔ وزیر جنگ مصطفیٰ کمال کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، لیکن اسے کمال کے ارادوں پر شک تھا، کیونکہ وہ اس کے منصوبوں سے واقف تھا۔ اس کے باوجود، اس نے فوراً اتفاق کیا اور مصطفیٰ کمال کو خبر دی، جس نے جواب دیا کہ اس دوران جبکہ مشرقی صوبوں میں بدامنی پھیلی ہوئی ہے، تو تیز رفتار تحقیقات کے لیے اور مناسب اقدامات کیے جانے کے لیے لازماً اس بات کی ضرورت ہو گی کہ اسے وسیع تر اختیارات دیئے جائیں تا کہ اس کے احکامات نافذ ہوں۔ وزارت نے اس کے تمام مطالبات سے اتفاق کر لیا۔

مصطفیٰ کمال اس وقت تک خاموش اور پر سکون تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ سلطان اور حکومت کے خلاف دشمنی کے جذبات رکھتا ہے، کیونکہ وہ مکمل رازداری کے ساتھ حامیوں کو جمع کیا کرتا تھا۔ وسیع تر اختیارات کے حصول کے لیے اس کی بیتابی نے اسے پہلے ان ہدایات کو مسترد کرنے پر مجبور کیا جو اسے موصول ہوئی تھیں۔ اس نے ان کا جائزہ لیا اور انہیں نئے سرے سے ایک خاص طریقہ کار (فارمیٹ) سے لکھا جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بنایا گیا تھا جس کا وہ مطالبہ کر رہا تھا۔ ہدایات کا جائزہ لینے کے بعد، اس نے اپنے فارمیٹ کے مطابق لکھی گئیں ہدایات کو وزیر اعظم کے سامنے پیش کیا جس نے نظر ثانی کیے بغیر ان پر دستخط کر دیے۔ پھر وہ انہیں وزیر جنگ کے پاس لے گیا جس نے پہلے تو ہچکچاہٹ کی اور پھر دستخط کر دیے۔ ان ہدایات کی کاپیاں برطانوی ہائی کمشنر، اتحادی افواج کے جنرل کمانڈر ہیرنگٹن اور اتحادی افواج کے تمام افسران کو بھیجی گئیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ صرف برطانیہ ہی واحد ملک تھا جس نے انتشار کو روکنے کے لیے ضرورت سے زیادہ تشویش اور خواہش کا اظہار کیا۔ جہاں تک فرانس کا تعلق ہے، اسے اس مغلوب سلطنت میں کسی بھی طرح کے قابل توجہ انتشار کی توقع نہیں تھی، اس لیے اس نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔

اس کے باوجود، جب مصطفی کمال کو اس کی ہدایات دی گئیں، اور جب اس نے اپنے مطلوبہ تمام لازمی اختیارات حاصل کر لیے، تو وہ اناطولیہ کے لیے روانہ ہوا اور 15 مئی کو استنبول سے ایک چھوٹے جہاز انیپولی (Anipoli) پر سوار بحیرہ اسود کے راستے سامسون (Samsun) پہنچنے کی امید میں نکلا۔

برطانیہ کی ازمیر پر یونانی قبضہ ممکن بنانے کیلئے سازشیں:

اسی اثناء میں، اپریل 1919 کے دوسرے ہفتے میں، عثمانی حکومت کو بتایا گیا کہ جنگ بندی کی شرائط سے متعلق ساتویں آرٹیکل کے مطابق، اتحادی ازمیر پر اپنا قبضہ کرنے والے ہیں، اور اس آرٹیکل کے مطابق، جب بھی ان کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو تو اس پر عمل کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ چنانچہ وزیر اعظم داماد فرید پاشا نے ازمیر کے والی کو اپنی ہدایات دیں۔ اس نے فوجوں کو اپنی بیرکوں کے اندر رکھنے کی ضرورت پر زور دیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ مقامی لوگوں کی جانب سے کسی بھی قسم کا مظاہرہ ہونے پر پابندی لگا دیں۔

14 مئی 1919 کو برطانوی بحری بیڑے کو ازمیر کے ارد گرد سمندر کے کنارے پر دیکھا گیا۔ بحری بیڑے کے کمانڈر ایڈمرل کولتھورپ نے والی سے کہا کہ وہ اتحادی افواج کے لیے تیار رہیں جو اترنے والی تھیں۔ پھر اس نے والی کو ملاقات کے لیے بلایا۔ جب وہ پہنچا تو اس نے اس سے کہا: "میں نے ابھی سنا ہے کہ یہ یونانی ہوں گے جو ازمیر پر اتریں گے اور قبضہ کریں گے۔" والی حیران رہ گیا اور ایڈمرل کی جانب بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا اور وہ بے تحاشہ بہنے لگے اور اس نے گھٹی ہوئی آواز میں ذلت اور مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "یونانی! یونانی ازمیر پر قبضہ کرنے آئے ہیں؟" ایڈمرل نے جواب دیا: "یہ وہ احکامات ہیں جو مجھے پیرس سے موصول ہوئے ہیں۔" والی نے کہا: "میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں اور میں پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ کیا ہوگا۔" کمانڈر نے اس سے کہا:

"یونانیوں کے علاوہ کسی اور کا ازمیر پر قبضہ کرنا ناممکن ہے۔ کیا آپ یہ بات سمجھتے ہیں؟" اس پر والی نے اس سے کہا: "مجھے مسلمانوں کو یقین دلانے اور یہ ثابت کرنے کے لیے آپ کے تین سو سپاہیوں کی ضرورت ہے کہ یہ قبضہ یونانیوں کا نہیں بلکہ اتحادیوں کا ہے اور یہ قبضہ مستقل نہیں بلکہ عارضی ہے۔" کمانڈر نے جواب دیا: "ناممکن۔" اور یہ کہہ کر اس نے بات ختم کر دی۔

15 مئی 1919 کی صبح، اسی دن جب مصطفیٰ کمال مشرقی صوبوں میں بدامنی کو روکنے کے لیے برطانوی اور عثمانی حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے استنبول سے نکلا، یونانی سپاہیوں نے ازمیر کی بندرگاہ کے راستے پر اترنا شروع کیا۔ تمام یونانی برادری ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے باہر تھی، اور ان کے جوش و خروش کو بیان کرنا مشکل تھا۔ وہ نعرے لگانے لگے اور یونانی فوجیں ازمیر کی گلیوں میں گھومنے لگیں۔ جہاں تک ترک مسلح افواج کا تعلق ہے، وہ وزیر اعظم کی طرف سے جاری کردہ سخت ہدایات کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی بیرکوں میں بیٹھے رہے۔ تاہم، یونانی برادری اور یونانی فوج اشتعال انگیز اور متکبرانہ طریقے سے سڑکوں پر جشن منا رہے تھے اور گھوم رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ازمیر کے مقامی لوگ اور ازمیر میں عثمانی فوج پیچھے رہے۔

تاہم، جیسے ہی یونانی مسلح افواج سرکاری عمارتوں تک پہنچی، ایک گولی چلائی گئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی تھی لیکن جو بات یقینی تھی وہ یہ ہے کہ یہ جان بوجھ کر یونانی فوج کو مشتعل کرنے کے لیے چلائی گئی تھی۔ اس لیے گولی کی آواز سنتے ہی وہ جم گئے۔ اس کے بعد انہوں نے عثمانی سپاہیوں اور ازمیر کے لوگوں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی، جس سے متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ کچھ مقامی لوگوں نے اپنا دفاع شروع کر دیا جس کے نتیجے میں ہلچل مچ گئی اور افراتفری پھیل گئی۔ یونانی سپاہیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بدلہ لینے کی اپنی بھڑکتی ہوئی خواہش کو پورا کیا۔ انہوں نے اپنی نفرتیں ظاہر کر دیں اور مسلمانوں کا خون بہا کر اپنی پیاس بجھائی۔ انہوں نے افسروں کے منہ پر تھوک کر انہیں اکسانا شروع کر دیا اور ہر ترک کو اپنے پیروں سے اپنے تربوش (ٹوپی) پر مہر لگانے پر مجبور کر دیا اور انکار کرنے والوں کو فوراً اپنی تلواروں سے خوفناک وحشیانہ انداز میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ پھر انہوں نے

مسلم خواتین کے چہروں سے حجاب ہٹانا شروع کر دیا اور جنہوں نے حجاب اتارنے سے انکار کیا انہیں فوراً قتل کر دیا گیا۔ انہوں نے ہر قسم کی تذلیل اور اشتعال انگیزی کے تمام انداز اپناتے ہوئے مسلمانوں کے گھروں کو بھی لوٹنا شروع کر دیا۔ بلاشبہ یہ معمول کی بات نہیں تھی، بلکہ ایک سوچا سمجھا اقدام تھا جو ایک طے شدہ سازش کے تحت کیا گیا تھا۔

جب یہ وحشیانہ جرائم اور ہولناک اشتعال انگیزیاں 19 مئی 1919 کو ہو رہی تھیں، بحری جہاز انیپولی برطانوی بحری بیڑے اور یونانی بحری جہازوں کے درمیان ازمیر کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور مصطفیٰ کمال اتر کر شہر میں داخل ہوا۔ مصطفیٰ کمال 15 مئی کو بحیرۂ اسود کے راستے سامسون پہنچنے کی امید میں بحری جہاز انیپولی پر سوار ہو کر استنبول سے روانہ ہوا تھا لیکن وہ سامسون جانے کی بجائے ازمیر چلا گیا۔

ایسا لگتا تھا کہ حکومت کو اس بات کی ہوا مل گئی، کیونکہ 16 مئی 1919 کی شام کو، جس رات مصطفیٰ کمال استنبول سے روانہ ہوا تھا، وزیر اعظم داماد فرید پاشا نے برطانوی ہائی کمشنر کے ایک نمائندے سے فوری ملاقات کی درخواست کی اور اسے سمجھایا کہ سلطان نے مصطفیٰ کمال کو مشرقی صوبوں میں بھیجنے کے بارے میں اپنا ارادہ بدل لیا ہے، کیونکہ اسے خبر پہنچی تھی کہ مصطفیٰ کمال اندرون صوبوں میں بدامنی پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یوں ان کا سفر کسی بھی قیمت پر منسوخ کرنا پڑے گا۔ انہوں نے اسے یہ تاثر دیا کہ اسے روکنے اور واپس آنے پر مجبور کرنے کے احکامات جاری کیے جائیں گے۔ تاہم، انہوں نے کچھ نہیں کیا اور مصطفیٰ کمال نے 19 مئی کو ازمیر پہنچنے تک جہاز پر اپنا سفر جاری رکھا، اور یہ یونانیوں کی مخالفت اور اشتعال انگیزی کے عروج کا وقت تھا۔

جیسے ہی وہ پہنچا، اس نے والیوں کو جمع کیا اور انہیں بتایا کہ وہ یونان کے خلاف کچھ مخصوص اقدامات کرنے والا ہے اور ان اقدامات کو حکومت منظور کر چکی ہے۔ پھر اس نے یونانیوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا، فوجی اور سویلین سربراہان کو اکٹھا کیا اور ان سے خطاب کیا کہ وہ عوام کو قوم پرست مظاہروں کے لیے تیار ہونے کی تاکید کریں، جبکہ عیسائیوں کو نقصان پہنچانے کے خلاف انتباہ دیا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ مظاہرے پرامن ہونے چاہئیں۔ اس نے ان سے جو کہا تھا اس کا حوالہ دیتے ہوئے: "پیر تک، آپ قوم پرستانہ مظاہرے کا اہتمام کر چکے ہوں گے، جب ایک بہت

بڑا جلسہ ہوگا جو پوری آبادی پر مشتمل ہوگا اور جہاں پر آتش فشاں تقریریں کی جائیں گی۔ ان تقاریر کا اصل مقصد قوم پرستانہ جذبات کو ابھارنا اور ترک عوام کے جذبے کو اجاگر کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مظاہرے اتحادیوں (Allies) میں ناانصافی کے احساس کو بھڑکائیں اور انہیں اس ظلم کا احساس دلائیں جو ہم پر ڈھائے گئے ہیں۔ مجھے قطعی طور پر یقین ہے کہ ہمارے پرامن قوم پرست مظاہرے انگریزوں میں سے امراء اور مغربی معززین کی توجہ حاصل کریں گے تاکہ ہمارے حساس ترین قومی معاملات میں اس شرمناک مداخلت کو ختم کریں۔ مظاہرے پوری ولایہ میں ہونے چاہیئں اور موثر تار (ٹیلی گرام) بڑی طاقتوں اور سبلائم پورٹ (Sublime Porte) کو بھیجے جانے چاہئیں، اور میں آپ کو واضح طور پر متنبہ کرتا ہوں کہ کسی کو بھی عیسائیوں کو کسی بھی طرح سے نقصان پہنچا کر کسی بھی قسم کی پریشانی پیدا کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ہمارے مظاہرے قوم پرست اور پرامن ہونے چاہئیں۔

پھر اس نے حکام پر مقامی لوگوں کی طرف سے بھیجے گئے سخت ٹیلی گراموں کے ایک سلسلہ کی بارش شروع کر دی، جن میں سے ایک ٹیلی گرام تھا جس میں لکھا گیا تھا: "ملک خطرے میں ہے"، اور دوسرے میں لکھا تھا: "مرکزی حکومت اب اپنے بنیادی فرائض کی انجام دہی کے قابل نہیں رہی۔"، اور ایک اور میں تھا: "ہم صرف قوم کے عزم اور قوموں کی کوششوں سے اپنے ملک کی آزادی کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔" سخت ترین ٹیلی گراموں میں سے ایک سٹریٹیجک ملٹری پورٹ سینوب (Sinub) سے استنبول کو بھیجا گیا تھا، جس میں عوام نے شدید غصے کا اظہار کیا تھا۔ ٹیلی گرام میں لکھا تھا: "ترک قوم کے نصیب میں ایسی حکومت کے ساتھ رہنا نہیں لکھا ہو سکتا جسے یورپ اپنی مرضی سے کنٹرول کرے اور جس پر وہ جو چاہے حکم دے"۔

مصطفیٰ کمال کا خلافت کے خلاف بغاوت میں پہلا اقدام:

اس ٹیلی گرام کے نتیجے میں سینوپ (Sinop) کے والی کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا اور سلطان کی جانب سے اس کے وزیر اعظم اور مصطفیٰ کمال کے درمیان ٹیلی گرام کا تبادلہ ہوا جس میں سلطان نے مصطفیٰ کمال کو فوری واپس آنے پر زور دیا۔ تاہم، مصطفیٰ کمال نے انکار کر دیا اور ایک ٹیلی گرام بھیجا جس میں اس نے کہا: "میں ملک کی

آزادی تک اناطولیہ میں ہی رہوں گا۔" یہ واضح انکار بغاوت کی طرف پہلا قدم تھا۔ اور وہ لوگوں کو جمع کرتا رہا اور اناطولیہ میں گھومتا رہا یہاں تک کہ اس نے بغاوت کو بھڑکا دیا۔

اس طرح مصطفی کمال نے اپنی بغاوت کا آغاز کیا، جس کا اختتام خلافت کے خاتمے اور ترکی کی دولت عثمانیہ کے دوسرے حصوں سے علیحدگی، یا مغرب کے مطابق، سلطنت عثمانیہ کی تباہی پر ہوا۔ صرف ان واقعات سے ہی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس بغاوت کو بھڑکانے کے لیے سب کچھ انگریزوں نے ہی شروع کیا تھا اور انہوں نے ہی مصطفی کمال کو یہ سب کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ مشرقی صوبوں میں گڑبڑ ہوئی ہے، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ مصطفی کمال جا کر ان ہنگاموں کو ختم کرے، یہی وہ تھے جنہوں نے اپنے بیڑے کی سرپرستی اور حفاظت میں یونانیوں کو ازمیر پر قبضہ کرنے اور اس طرح کی اشتعال انگیزی پیدا کرنے کی ترغیب دی۔ نیز یہ انگریز ہی تھے جو مصطفی کمال کو عثمانی حکام کی طرف سے واپس جانے کی التجا کے باوجود ازمیر لے آئے تھے اور جنہوں نے اس کے لیے فوری طور پر ان اشتعال انگیزیوں سے فائدہ اٹھانے اور لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے کی راہ ہموار کی۔ یہ واقعات بذات خود یہ سب بولتے ہیں اور انتہائی واضح طور پر اس حتمی سچائی کی نشاندہی کرتے ہیں جس پر ہر کوئی اپنی انگلی رکھ سکتا ہے۔

برطانیہ کی جانب سے مصطفی کمال کی بغاوت کی پشت پناہی

اس سب کے باوجود اگر بعد میں برطانیہ مصطفی کمال کو اس بغاوت کو آگے بڑھانے کے لیے اکیلا چھوڑ دیتا جو اس نے خود شروع کی تھی تو وہ اس مقصد کی طرف مزید ایک قدم نہ اٹھا پاتا، جو مقصد اس نے بعد میں حاصل کیا۔ یہ اس لیے کہ اگر ترکی میں کوئی ایسا شخص ملنا ممکن بھی ہوتا جو عربی بولنے والے اسلامی علاقوں کو عثمانی ریاست سے الگ کرنے پر راضی ہو جاتا اور جو صرف ترکی کی سرزمین پر ہی اکتفا کر لیتا تو یہ بہت مشکل تھا کہ کوئی ایسا شخص ملتا جو خلافت کے خاتمے کی اجازت دیتا یا اس پر اتفاق کر لیتا، سوائے مصطفی کمال اور کچھ ایسے افراد کے، جن کی تعداد مٹھی بھر سے زیادہ نہ تھی۔ عمومی اتفاق رائے خلافت کو برقرار رکھنے کے حق میں تھا۔ لوگوں کے دلوں میں خلافت کی محبت اور اس سے وفاداری کی جڑیں بہت گہری تھیں اور جب بھی "بادشاہین تاجوک یاشا" کا فقرہ سامنے آتا تو ہر ایک ترک کے دل کے تار ہلتے اور اس کے جذبات بھرپور طریقے سے ابھرتے۔ اس لیے امت کے کسی بھی نمائندے کے لیے خلافت کو ختم کرنے کا فیصلہ کرنا ناقابل فہم تھا۔

تاہم، برطانیہ کی طرف سے اختیار کیے گئے انداز اور اس کی جانب سے مصطفی کمال اور اس کی جاری کردہ سرگرمیوں کی مسلسل حمایت نے مصطفی کمال کو ان نتائج حاصل کرنے میں مدد دی۔ اس بغاوت کو بھڑکانے کے دوران، برطانیہ بغاوت کے ثمرات حاصل کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی چال کی تیاری کر رہا تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے اس کے لیے ایک وسیع پروپیگنڈا مہم چلائی اور ترکی کے بارے میں اتحادیوں کے خدشات کو بڑھانے کی کوشش میں ایسی خبروں کو اچھالنا شروع کر دیا۔

مغربی باشندوں اور افسروں کی طرف سے استنبول کو بھیجی گئی رپورٹیں جمع کی گئیں، جو اناطولیہ میں پیدا ہونے والے بڑے ہنگامے اور ابھرنے والے قوم پرست جذبے کی تفصیل سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلی گرام اور خبر رساں ایجنسیوں نے بغاوت کی خبروں کو مبالغہ آمیز انداز میں نشر کرنا شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں پیرس میں

اتحادیوں کی شرکت کے لیے امن کانفرنس طلب کرلی گئی۔ برطانیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کانفرنس کے ورکنگ ایجنڈے میں ان خلفشار کی خبریں زبردستی شامل کیں جسے مصطفٰی کمال نے بھڑکایا تھا،تاکہ دلوں میں بغض پیدا کیا جائے اور سخت شرائط عائد کرنے پر زور دیا جائے۔

تاہم فرانس کو اس حقیقت کا علم تھا کہ یہ اقدامات برطانیہ نے گھڑ لیے تھے،اس لیے اس نے مصطفٰی کمال کے خلفشار کی خبروں کو مسترد کردیا اور یہاں تک کہ ایک قدم آگے بڑھ کر داماد فرید پاشا کی حکومت کا دل اپنی جانب پھیرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا فرانس نے داماد فرید پاشا کو یقین دلایا کہ وہ اس بغاوت پر نادم نہیں ہے،اور جب فرانس کو اس کے خود پیرس آنے کے ارادوں کا علم ہوا تاکہ وہ اتحادیوں کی ہمدردی حاصل کرسکے اور ان کا دل جیت سکے، تو اس نے دوڑ کر عثمانی وفد کو آنے کے لیے ایک بکتر بند جنگی بحری جہاز پیش کیا۔ یہ وفد وزیر اعظم کی سربراہی میں پیرس امن کانفرنس میں شرکت کرنا چاہتا تھا تاکہ عثمانی ریاست کی قسمت کا فیصلہ کیے جانے سے پہلے اس کے خیالات کا ذکر کیا جا سکے۔

تاہم، برطانیہ نے اس پر اعتراض کیا اور عثمانی حکومت کی طرف فرانس کے جوش و جذبے پر تشویش کا اظہار کیا۔ برطانیہ نے داماد فرید پاشا کو شرکت سے روکنے کی کوشش کی، لہٰذا اس نے بہانہ کیا کہ وہ وفد کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن اس کی خراب صحت نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ آخر کار وہ ایک برطانوی بکتر بند جہاز پر سوار ہوا۔

پیرس کانفرنس نے کچھ انتہائی سخت شرائط رکھیں،اور یہ برطانیہ ہی تھا جس نے ان فیصلوں کو اپنایا اور ان کی حمایت میں آگے آگے رہا۔ لائیڈ جارج (Lloyd George) نے 8 نومبر 1919 کو گلڈ ہال (Guildhall) میں ایک تقریر کی جس میں اس نے کہا: "امن کی شرائط کو اتحادیوں نے مکمل طور پر منظور کرلیا ہے، خاص طور پر وہ شرائط جو سلطنت عثمانیہ سے متعلق ہیں،اور پورا یورپ متفقہ طور پر اس بات پر رضامند ہے کہ بری اور بوسیدہ عثمانی حکومت کا اس زمینوں سے خاتمہ ہونا چاہیے جو یونانیوں، آرمینیوں اور عربوں سے آباد ہیں۔ بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم کے کنارے واقع بندرگاہوں کو تمام اقوام کے لیے کھول دیا جانا چاہیے۔" تاہم فرانس اور اٹلی اس معاہدے کے خلاف

تھے۔اس کے باوجود،ان شرائط کے بارے میں برطانیہ کا جوش وجذبہ ان پر عمل درآمد کے مقصد سے نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد عثمانی ریاست کو دھمکانا اور ترکوں کو سلطان کے خلاف اکسانا تھا تاکہ وہ مصطفیٰ کمال کا ساتھ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں برطانیہ ہی سب سے پہلے اس معاہدے کو منسوخ کرنے کے لیے لندن میں کانفرنس بلانے والا تھا۔ یہ کانفرنس فروری 1921 میں منعقد ہوئی۔

مصطفیٰ کمال کی بغاوت کا پہلا دور

اس کے باوجود بغاوت جوں کی توں جاری رہی اور برطانیہ کو مصطفیٰ کمال کی مدد کے لیے آنا پڑتا جب بھی اسے ان کی ضرورت پڑتی۔ بغاوت شروع میں کامیاب رہی، کیونکہ نوجوان افسران مصطفیٰ کمال کے ساتھ شامل ہوئے اور اس کی پیروی کے لیے اپنی رضامندی کا اعلان کیا۔ کچھ اعلیٰ عہدے دار بھی اس کے ساتھ شامل ہوئے لیکن اس شرط پر کہ وہ خلافت کو کمزور نہیں کرے گا۔ جب افسران شامل ہو گئے اور یوں کافی قوت جمع ہو گئی تو اس نے فوری طور پر حکومت قائم کرنا چاہی۔ اس لیے اس نے سیواس (Sivas) سے رفعت پاشا کو مدعو کیا۔ رفعت پاشا مغربی افکار کے بہکاوے میں آ چکا تھا اور یورپیوں کا بہت بڑا مداح تھا۔ مصطفیٰ کمال نے انقرہ ریجن کے آرمی کمانڈر علی فواد کو بھی مدعو کیا، جو ایک شاندار عسکری تعلیم یافتہ شخصیت تھا اور ہوشیار سیاستدانوں میں سے تھا۔ علی فواد کے ساتھ رفعت پاشا بھی تھا جس نے بحریہ کی وزارت (Naval ministry) سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

افسران کے درمیان ایک ملاقات ایک سیکرٹری کے ساتھ ہوئی جس نے اراکین کے لیے ملاقات کا خلاصہ (minutes of meeting) لکھنے کا کردار سنبھالا۔ مصطفیٰ کمال نے اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا اور اپنی آراء کی وضاحت کی۔ سب نے اس سے اتفاق کیا کہ مزاحمت ہی واحد امید ہے۔ اس لیے، انھوں نے عمل درآمد کے لیے ایک حکمت عملی تیار کی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یونانی افواج کی پیش قدمی کو روکنے اور ناکام بنانے کے لیے ازمیر کے ارد گرد جنگی گروہوں (militias) کو بڑھانا اور منظم کرنا۔ پھر ان چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے نتیجہ میں اور منقسم افواج کی بنیاد پر ایک منظم اور طاقتور باقاعدہ قومی فوج تشکیل دینا۔

مزاحمت کی قیادت کرنے کے لیے ایک حکمت عملی وضع کرنا بھی ضروری تھا۔ اس طرح وہ اس بات پر متفق ہوئے کہ فواد مغرب میں فوجوں کی کمان سنبھالے گا، کاظم قرة باقر مشرق میں فوجوں کی کمان سنبھالے گا اور مصطفیٰ کمال مرکز میں فوجوں کی کمان سنبھالے گا۔

پھر مصطفیٰ کمال نے کہا: ”مرکزی حکومت اور سلطان دشمنوں کے زیر اثر ہیں، اس لیے ہمیں یہاں اناطولیہ میں ایک وقتی حکومت قائم کرنی چاہیے۔“ وہ یہ کہہ کر ختم ہوا ہی تھا کہ سب نے حیرت اور غصے کا اظہار کیا۔ رؤف نے ایسے کسی اقدام سے مخالفت کا اظہار کیا جو خلیفہ یا اس کی مرکزی حکومت کو مضطرب کرے۔ باقی سب نے بھی مصطفیٰ کمال کی مخالفت کی اور اس سے کہا کہ اگرچہ انہیں اس پر بھروسہ ہے لیکن یہ کہ جب تک وہ ملک کی خدمت کر رہا ہے اور ملک کی راہ میں قربانیاں دے رہا ہے، تو ان کی شرط صرف یہ ہے کہ وہ کوئی بھی ایسا اقدام کرنے سے گریز کرے جو سلطان کے حقوق کو مجروح کرے یا اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے۔ انھوں نے اس سے اس بات پر بھی زور دیا کہ خلافت کو ہر چیز سے بالاتر ہونا چاہیے اور سلطنت کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔

اس اتفاق اور اس اصرار کے پیش نظر مصطفیٰ کمال کو پسپائی اختیار کرنا پڑی اور عوام کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔ چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ خلافت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اس نے انہیں تمام ضمانتیں دیں جو وہ چاہتے تھے۔ پھر باغیانہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔

تاہم، چونکہ یہ بغاوت مصطفیٰ کمال کا ساتھ دینے والوں کی اکثریت کے لیے اتحادی قابضوں کے خلاف بغاوت تھی، اور سلطان کے خلاف بہت کم درجہ کی تھی، اور چونکہ یہ حقیقت میں مصطفیٰ کمال اور اس کے مٹھی بھر حامیوں کے لیے سلطان کے خلاف بغاوت تھی، مصطفیٰ کمال اپنے ارادوں کو چھپانے پر مجبور تھا اور اس نے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ خلافت کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس لیے اتحادیوں کے ساتھ جھڑپیں ناگزیر تھیں۔ اس موقع پر دو عجیب و غریب واقعات پیش آئے۔

سامسون (Samsun) پر قبضہ کرنے کا ڈرامہ:

پہلا واقعہ یہ کہ برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ سامسون کو ایک مضبوط گیریژن کے ذریعے محفوظ بنانے کے لیے پر عزم ہیں تاکہ باغیوں کو سمندر کے راستے اس تک پہنچنے اور سیواس (Sivas) پر قبضہ کرنے سے روکا جا سکے۔ مصطفیٰ کمال نے رفعت کو حکم دیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر سامسون کا دفاع کرے۔ اس نے اسے حکم دیا کہ وہ انگریزوں کے سامنے

کھڑا ہوا اور انہیں اپنی فوجوں کو اتارنے سے روکے۔ چنانچہ رفعت نے حکم کی تعمیل کی اور سو مسلمان مردوں کے ساتھ بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ ایک برطانوی کرنل ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ بندرگاہ پر پہنچ گیا تھا۔ تاہم، رفعت اور اس کی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں اور اس فوج کا سامنا کیا لیکن ان کے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد برطانوی کرنل اور اس کے ساتھ والے اس برطانوی جہاز پر واپس آئے جو بندرگاہ میں لنگر انداز تھا اور وہاں سے چلے گئے۔ پھر سب کے سامنے یہ اعلان کیا گیا کہ برطانوی فوج خوفزدہ ہو گئی ہے اور اس کے کمانڈر نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ مزاحمت کرنا بے فائدہ ہے اس لیے وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس طرح انہوں نے اعلان کیا کہ سامسون کو برطانوی قبضے سے چھڑالیا گیا ہے اور سیوااس مقامی لوگوں کے پاس رہا ہے۔

مصطفی کمال کی بغاوت کا مسلح جنگ کا روپ دھارنا:

دوسرا واقعہ یونانیوں کے ساتھ پیش آیا۔ برطانیہ یونانیوں کو ترکوں کے ساتھ بیشمار جھڑپوں میں شامل کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا، جس سے مقامی لوگوں کا جوش بڑھ سکتا تھا۔ برطانیہ اس مقصد کے لیے اپنے لوگوں کا خون بہانے سے گریزاں تھے کیونکہ ایک اور خون تھا جسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بہایا جا سکتا تھا۔ اس طرح یونانیوں کو ان جھڑپوں میں قربانی کے بکرے کے طور پر چنا گیا۔ اس واقعہ کی تفصیل کچھ یوں تھی: یونانی ازمیر تک محدود رہنے پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے اور ازمیر کے گورنر نے ازمیر میں رہنے کے لیے اسے دی گئی ہدایات کی خلاف ورزی کی۔ لہٰذا یونانی پڑوسی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے چلے گئے۔ یونانی سپہ سالار اپنی فوجوں کی قیادت کرتے ہوئے ضلع عدین (Aideen) کی طرف بڑھا اور جونہی فوج آگے بڑھی تو ان پر گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ یوں یونانی فوجیں حیرت اور گھبراہٹ کا شکار ہو گئیں، اور وہ اپنی ہمت کھو بیٹھے۔ انہوں نے شہریوں پر گولیاں چلائیں اور ترکوں نے بھی منہ توڑ جواب دیا۔ اس بے ترتیب لڑائی کے نتیجے میں، یونانیوں کو شکست ہوئی اور ترکوں نے انہیں زبردستی پیچھے ہٹا دیا اور یونانی ضلع کو آگ لگادی۔ جب ان کی تعداد میں اضافہ ہوا اور جب ان کی فوجی تیاریاں بڑھیں تو یونانی فوج واپس آ گئی اور انہوں نے بدلے میں شہر پر قبضہ کر لیا اور ترک ضلع کو آگ لگادی۔ پھر انہوں نے ازمیر میں ترکوں کی تعداد کم

کرنے کے لیے شہریوں کو وحشیانہ طریقے سے قتل کرنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ہر ترک جو لڑنے کے قابل تھا ہتھیار اٹھا کر پہاڑیوں کی طرف گیا اور حملہ آوروں سے لڑنا شروع کر دیا۔ یہ گوریلا جنگ وقفے وقفے سے جاری رہی۔ اس کے نتیجے میں لوگوں میں انگریزوں اور یونانیوں کے خلاف ناگواری کا احساس پیدا ہوا اور افسران مصطفیٰ کمال کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے اور اس نے اپنی طرف سے انہیں دیہاتوں کی جانب بھیجنا شروع کر دیا تاکہ وہ اپنی آگ بجھا سکیں۔ اس کی خبر کو بڑھا چڑھا کر دارالحکومت تک پہنچایا گیا اور برطانیہ نے سلطان کے سامنے اپنا احتجاج ظاہر کیا۔ سلطان کی طرف سے مصطفیٰ کمال کو بھیجے گئے تاروں اور بلاووں کا کوئی فائدہ نہ ہوا، کیونکہ اس نے اپنی نافرمانی کا کھلم کھلا مظاہرہ کیا۔ اس کے جواب میں سلطان نے اس کی برطرفی کا حکم دیا اور تمام فوجی اور سویلین حکام کو مصطفیٰ کمال کی ہدایات پر عمل نہ کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ اس کی برطرفی کی خبر پورے ملک میں نشر ہوئی اور سلطان نے فوجی افسروں کی فہرست سے اس کا نام نکال دیا اور سب کو یہ اعلان کیا کہ جو بھی اس سے رابطہ کرے گا اسے خلاصہ برخاست کر دیا جائے گا۔ اس پر مصطفیٰ کمال نے فوجی افسران کو اپنی ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا کہ اگر انہیں برطرف کر دیا جائے تو وہ کام کرنا بند نہ کریں، بشرطیکہ وہ سلطان کو بتا دیں کہ نئے تعینات ہونے والے افسر نے فوج اور نہ ہی عوام کا اعتماد حاصل کیا ہے، اور اس طرح وہ فوج کا حصہ نہ بن سکا۔ مصطفیٰ کمال ہفتوں تک عوام کو بغاوت کی تلقین کرتا رہا، اور حکومتی اقدامات کو ناکام بنانے اور ان کے خلاف مزاحمت کرنے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرتا رہا۔

ارض روم کانفرنس:

23 جولائی 1919 کو، میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) کے ایک دور افتادہ ضلع میں، کئی لوگ گاؤں کے ایک اسکول سے ملتی جلتی ایک چھوٹی سی عمارت میں جمع ہوئے۔ وہ اراکین مشرقی صوبوں سے پارلیمنٹ کے ممبران (deputies) تھے۔ وہ ایک عجیب امتزاج تھا۔ ان میں سابق ممبران، شیوخ، اعلیٰ سرکاری ملازمین، کرد قبائلی رہنما اور افسران شامل تھے۔ کانفرنس کا آغاز امت کے نام پر ہوا اور ایجنڈے میں زیر بحث آنے والا پہلا مسئلہ کانفرنس کی صدارت کا مسئلہ تھا۔ ایک رکن (delegate) نے کھڑے ہو کر کہا: "کیا معزز اراکین اپنی رائے دے سکتے ہیں کہ

کیا مصطفیٰ کمال اس اجلاس کی صدارت کرنے کے لیے موزوں ہیں؟" یہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنی زندگی میں کبھی کسی مشرقی صوبے کا ممبر پالیمنٹ (deputy) نہیں رہا۔ اس ممبر کو اچانک روک دیا گیا اور مصطفیٰ کمال کو بھاری اکثریت سے کانفرنس کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا۔ یہ کانفرنس چودہ دن تک جاری رہی اور مباحثے بے ترتیب اور مشتعل طریقے سے ہوئے۔ کئی قراردادیں منظور کی گئیں پھر کانفرنس ختم ہو گئی۔ کچھ قراردادیں درج ذیل تھیں:

"امت ایک ایسی اکائی ہے جو ٹکڑے ٹکڑے یا تقسیم کا شکار نہیں ہو سکتی، اور تمام مشرقی ولایات کسی بھی قسم کے قبضے کے خلاف مزاحمت کرنے اور غیر ملکی مداخلت کا مقابلہ کرنے کے لیے پر عزم ہیں۔ اب جب کہ حالات اس نازک موڑ پر پہنچ چکے ہیں، اگر استنبول کی حکومت نے عوام کا ساتھ دینے اور غیر ملکی قبضے سے ان کی حفاظت کرنے سے انکار کر دیا تو ملکی معاملات چلانے کے لیے ایک اور عبوری حکومت کو بلانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہو گا۔

ممبران نے یہ بھی واضح طور پر اعلان کیا کہ وہ اب بھی خلیفہ وحید الدین کے وفادار ہیں اور ان کی بیعت ان کی گردنوں پر ہے۔ ایک کمیٹی قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا جسے "ایگزیکٹیو پارلیمانی کمیٹی" کا نام دیا گیا اور جس کا کام کانفرنس کی منظور کردہ قراردادوں پر عملدرآمد کرنا تھا۔ مصطفیٰ کمال کو اس کمیٹی کا چیئرمین منتخب کیا گیا اور قراردادوں کو فوری طور پر امت تک پہنچایا گیا اور ان کی کاپیاں یورپی ممالک کو روانہ کی گئیں۔ پھر سیواس (Sivas) کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔

تاہم، جب استنبول کی حکومت کو "ارض روم" کانفرنس کا علم ہوا، تو اس نے ایک اعلامیہ جاری کیا جسے اس نے تمام اخبارات میں تقسیم کیا۔ اسے دنیا بھر کے اخبارات نے بھی رپورٹ کیا۔ اعلامیہ سے منقول ہے: "اناطولیہ میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی ہے اور ان گنت اجلاسوں کے دوران جن کا مقصد نظام کی خلاف ورزی اور آئین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرنا تھا۔ اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ اجلاس آئینی اور پارلیمانی تھے، لیکن در حقیقت وہ پارلیمانی نہیں تھے۔ تمام فوجی اور سویلین حکام کو چاہیے کہ وہ اس تحریک کو مکمل طور پر ختم کر دیں اور ان باغیوں کو سخت ترین طریقہ سے کچل دیں۔"

یہ سرکاری کتابچے "ارض روم" میں موجود حکام تک پہنچے اور انہوں نے حکومت "آستانہ" (Astana) کو یہ کہہ کر جواب دیا: "پارلیمنٹ کے اجلاسوں کا انعقاد ایک لازمی ضرورت بن گیا ہے، اور اگر پارلیمنٹ کا انعقاد ہوتا تو اس قسم کے اجلاسوں کی ضرورت نہ ہوتی"۔

حکومت نے اپنی نازک صورتحال پر غور کیا اور محسوس کیا کہ اس کا پارلیمنٹ کو تحلیل کرنا غیر آئینی تھا اور اس نے نئے انتخابات کے لیے کوئی انتظامات نہیں کیے تھے۔ تاہم، اس نے بغاوت کو روکنے کے لیے بہت سے فوری اور فیصلہ کن اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا۔ لہذا، اس نے ایک فوج بنانے کا فیصلہ کیا جو صرف ان لوگوں پر مشتمل ہو گی جنہوں نے حقیقی وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر فوج کو اناطولیہ روانہ کیا گیا۔

برطانیہ کا سلطان کو مصطفیٰ کمال کی بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج بھیجنے سے روکنا:

جب برطانیہ کو اس فوج کا علم ہوا تو انہوں نے یہ دلیل دیتے ہوئے اتحادیوں کی طرف سے سلطان کو فوج بنانے سے روک دیا کہ جنگ بندی کی شرائط میں سے ایک شق میں فوجوں کو ختم کرنے اور ان کو دوبارہ سے تشکیل نہ دینے کی شرط رکھی گئی تھی۔ سلطان نے بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنے آپ کو کھلا ہاتھ دینے کی کوشش کی لیکن اتحادیوں نے اسے واضح طور پر ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس تناظر میں جب "اتحادی"(Allies) کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب برطانیہ ہوتا ہے، کیونکہ ان کا ملک پر غلبہ تھا اور یہ برطانوی ہائی کمشنر اور اس کا دفتر تھا، جو اتحادی افواج کے کمانڈر ان چیف ہیرنگٹن(Harrington) کے ساتھ مل کر اتحادیوں کی طرف سے کام کر رہے تھے۔

جب سلطان کو معلوم ہوا کہ اتحادی اسے انتشار پر قابو پانے کے لیے ایک ٹاسک فورس بھیجنے کی اجازت دینے سے انکار پر اڑے ہیں تو انہوں نے اتحادیوں سے رائے طلب کی کہ کون اس انتشار کو ختم کر سکتا ہے۔ سلطان اپنی درخواست پر سختی سے اڑے رہے، یہاں تک کہ اتحادیوں نے انہیں یہ کہہ کر جواب دیا کہ وہ غیر جانبدارانہ موقف اختیار کر رہے ہیں اور یہ کہ ترکی کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا ان کی صلاحیت سے باہر ہے۔ انہوں نے سلطان کو بتایا کہ اگر وہ ملک پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں تو امن وامان برقرار رکھنے کے لیے وہ خود ذمہ دار ہیں۔

داماد فرید پاشانے محسوس کیا کہ برطانیہ کی طرف سے مایوسی ہوئی ہے اور سلطان اب اپنے ذرائع استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لہٰذا اس نے مصطفیٰ کمال کو "ارض روم" سے سیواس جاتے ہوئے گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا، لیکن یہ منصوبہ ناکام ہو گیا کیونکہ مصطفی کمال کو مطلع کر دیا گیا تھا جس وجہ سے وہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے اور اپنے سفر کا وقت تبدیل کرنے میں کامیاب رہا۔ سپاہی اسے گرفتار کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے لیکن اسے اس کی مخصوص جگہ پر تلاش کرنے میں ناکام رہے، کیونکہ وہ اس سے پہلے ہی سیواس پہنچ چکا تھا۔

سیواس کانفرنس:

اس کے بعد سلطان نے غالب بیک سے کہا، جو سلطان کے سب سے بڑے حامیوں میں سے تھا، کہ وہ کچھ کرد قبائل کی سربراہی کریں اور سیواس شہر پر حملہ کریں، اور کانفرنس کے تمام اراکین کو گرفتار کر لیں۔ تاہم وہ ناکام رہا۔ کانفرنس کے اراکین اناطولیہ سے سیواس پہنچے تھے اور یہ کانفرنس 4 اگست 1919 کو منعقد ہوئی جس کی صدارت مصطفی کمال نے کی۔ تاہم اس کی چیئرمین پر اعتراض ہوا۔ کانفرنس شروع ہونے سے کچھ دیر قبل رؤف بیک، جو مصطفی کمال کے قریب ترین دوستوں میں سے تھا، اس کے پاس آیا اور کہا: "ہم نے کانفرنس کی صدارت کا جائزہ لیا ہے اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی ہے کہ آپ کو اسے کسی صورت قبول نہیں کرنا چاہیے۔"

جب مصطفی کمال کی صدارت میں کانفرنس بلائی گئی تو کچھ لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کے آمرانہ (autocratic) اقدامات پر اعتراض کیا کیونکہ اس نے بغیر ووٹنگ کے خود کو کانفرنس کا چیئرمین مقرر کیا تھا۔ اس پر مصطفی کمال اپنے دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جو کہا اس میں سے منقول ہے: "ہم آج جن کانفرنسوں میں ہیں وہ ہمیں ایک دوسرے سے لڑنے اور جھگڑنے کی اجازت نہیں دیتی ہیں، ورنہ سلطنت کے ستارے کو گرہن لگ جائے گا اور اس کا اثر و رسوخ لازمی طور پر ختم ہو جائے گا۔" اس جذباتی گفتگو کا اثر ہوا اور اس کے حامی تالیاں بجانے اور اسے سراہنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پھر سب نے اس کی صدارت پر خاموشی اختیار کر لی۔ جب ووٹ لیا گیا تو اعلان کیا گیا کہ مصطفی کمال نے اکثریت حاصل کر لی ہے۔

مصطفیٰ کمال کے چیئر مین منتخب ہوتے ہی وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس نے سلطان کے ساتھ اپنی وفاداری کا واضح طور پر اظہار کرتے ہوئے آغاز کیا، پھر کانفرنس کے اجلاس شروع ہوئے اور کئی دنوں تک شور و غل، گرما گرم بحثوں اور سرگوشیوں سے بھرپور چلتے رہے۔ اس کے بعد کئی اعتراضات سامنے آئے اور اراکین میں سے ایک نے یہ کہنے کے لیے کھڑے ہو کر کہا: "کانفرنس کی ایگزیکٹو کمیٹی کو یہ دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا کہ حکومت یہ ہے؛ اور اگر یورپی اناطولیہ کے معاملات میں مداخلت کریں اور اس پر قبضہ ہی کر لیں تو وہ کیا کریں گے؟ انہیں فوجیوں کے اخراجات اور ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگیوں کے لیے اموال (funds) کہاں سے ملیں گے؟ ایک اور رکن نے کھڑے ہو کر کہا: "امریکہ کے کوئی استعماری عزائم نہیں ہیں، وہ واحد ریاست ہے جو ترکی کو اس بند گلی سے نکال سکتی ہے جس میں وہ پھنسا ہوا ہے۔ اگر ترکی انحطاط سے اور خاتمے سے بچنے کے لیے سنجیدہ ہے تو وہ واحد راستہ جس کو وہ اختیار کر سکتا ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو امریکہ کے دامن میں ڈال دے۔" اس کے بعد رؤف بیک، بکر سمیع بیک، کاظم قرہ باقر، رفعت، علی فواد اور تینوں پاشا کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس رائے کی تائید کی اور دل و جان سے اس کا دفاع کیا۔ ایک اور رکن نے کھڑے ہو کر کہا: "امریکی مینڈیٹ آزادی کو ختم نہیں کرتا۔ اس طرح ہم برطانوی تسلط (protectorates) سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ یہ برطانوی ریاست ترکی کو اپنی ایک ذلیل کالونی میں تبدیل کر کے اسے غلامی کے درجے پر لے جانے والی ہے۔"

کانفرنس مصطفیٰ کمال کی تمام کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے اسی سمت میں آگے بڑھی اور اس تمام غور و خوض کے بعد، کانفرنس نے ایسی قراردادیں منظور کیں جو "ارض روم" میں منظور کی گئی قراردادوں سے مختلف نہ تھیں۔ تاہم، مصطفیٰ کمال پر اراکین کے غصے کے ساتھ کانفرنس مکمل ہو گئی۔ کاظم قرہ باقر پاشا، جو اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے اور اپنا ساز و سامان اتحادیوں کے حوالے نہ کرنے اور ان کے آگے ہتھیار نہ ڈالنے والا واحد فوجی کمانڈر تھا، مصطفیٰ کمال کے پاس گیا اور اس سے کہا: "آپ کی طرف سے مواصلات کا عہدہ اٹھانے نے تنقید کو جنم دیا ہے اے پاشا، آپ تصور کر

سکتے ہیں، جناب عالی، اس طرح کے اقدام اور اس طرح کے مشکل راستے پر چلنے کے نتائج۔ تو براہ کرم، اب سے کمیٹی کو خود اپنی طرف سے بات کرنے دیں۔"

لہٰذا، مصطفیٰ کمال جب کانفرنس سے نکلا تو وہ بہت ناراض تھا۔ تاہم، اس نے کانفرنس کے دوران اراکین کو اکسایا کہ وہ اپنا دفاع کریں، کیونکہ اس نے انہیں بتایا کہ غالب بیک، جو حکومت کا وفادار تھا، کانفرنس کے اراکین کو گرفتار کرنے کے لیے کچھ کرد قبائل کی سربراہی کرتے ہوئے آیا تھا۔ اس لیے انہوں نے محل سے براہ راست رابطہ کرنے کا مطالبہ کیا لیکن ان کی درخواست کو رد کر دیا گیا۔ اس سے وہ مشتعل ہو گئے اور وزیر اعظم داماد فرید پاشا کو الٹی میٹم جاری کرتے ہوئے کہا کہ اگر انہیں ایک گھنٹے کے اندر محل سے براہ راست رابطہ کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ مرکزی حکومت سے اپنے تمام روابط منقطع کر دیں گے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اقدامات کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ یہ مقررہ مدت 12 اگست 1919 کی صبح کو گزر گئی، اس طرح انہوں نے اپنی دھمکی پر عمل کیا اور ممبران اور محل کے درمیان تمام روابط منقطع ہو گئے۔

مصطفیٰ کمال نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ وہ استنبول کو باقی ملک سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چونکہ وہ کانفرنس کے دوران کچھ بھی حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا، اور چونکہ وہ اناطولیہ میں حکومت بنانے کی ہمت نہیں کر سکا، تو اس نے اپنے ساتھ والوں کو استنبول میں حکومت کی تبدیلی کا مطالبہ کرنے پر راضی کر لینے پر اکتفاء کیا۔ وہ خاموش رہے اور یہ بات نقل نہیں ہوئی کہ آیا انہوں نے ایسے اقدام کی حمایت کی یا مزاحمت کی۔ مصطفیٰ کمال کا خیال تھا کہ وہ فوج کو اس وقت تک کنٹرول نہیں کر سکتا جب تک کہ افسران اس کے حامیوں کے سرپر نہ ہوں، اور وہ اپنے خلاف بغاوت کرنے والوں کو اس وقت تک زیر نہیں کر سکتا جب تک کہ اسے فوج کی حمایت حاصل نہ ہو۔ فوج خلیفہ کے ساتھ تھی، اس کے ساتھ نہیں۔ انہوں نے اس پر یہ بات بھی بالکل واضح کر دی کہ خلیفہ کو ختم کرنا ناممکن ہے خواہ حالات کچھ بھی ہوں۔ اس لیے اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ خلیفہ کے ساتھ مفاہمت پیدا کی جائے نہ کہ داماد فرید پاشا کے ساتھ۔

ایک نئے مرحلے کی تیاری کیلئے مصطفی کمال کا خلیفہ کے ساتھ سمجھوتہ:

ایک طرف تو یہ تھا، دوسری جانب سیواس کانفرنس کی خبریں ایک مختلف رنگ میں استنبول پہنچی، گویا کہ یہ مصطفیٰ کمال کی فتح تھی۔ اس بات کی تائید استنبول حکومت کی طرف سے کانفرنس کے بائیکاٹ نے کی۔ اس قطع تعلقی کا سبب اگرچہ وہ اقدام تھے جو وزیر اعظم نے اٹھائے، جب اس نے کانفرنس اور شاہی محل میں براہ راست رابطہ نہ ہونے دیا، غالب بیک کو کرد قبائل کی قیادت کرتے ہوئے اراکین کو گرفتار کرنے کیلئے بھیجا، علاوہ ازیں بذاتِ خود بائیکاٹ نے اور کانفرنس کے انعقاد میں کامیابی نے اس تمام صورتحال کو بالکل عجیب رنگ میں پیش کیا۔

مزید برآں، اتحادیوں، یعنی برطانیہ نے استنبول کے حکام سے مصطفیٰ کمال کے ساتھ مفاہمت کی سفارش کی، اور اس دوران مصطفیٰ کمال کے سلونیکا (Salonika) کے دنوں کے قریب ترین دوستوں میں سے ایک دوست، جس کا نام عبدالکریم تھا، آگے آیا اور خلیفہ کو اپنے اور مصطفیٰ کمال کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنے کی تجویز دی۔ انہوں نے بتایا کہ مصطفیٰ کمال ہمیشہ خلافت اور خلیفہ کے ساتھ اور ذاتی طور پر ان کے وفادار رہے ہیں۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ اسے شرائط پر آنے کے لیے قائل کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس عکاس مزاج کی روشنی میں سلطان وحید الدین نے مصطفیٰ کمال کی طرف سے بغاوت کے خاتمے کے مطالبات سے اتفاق کیا۔ اس پر عبدالکریم نے سیواس کو ٹیلی فون کیا اور مصطفیٰ کمال سے بات کی، جنہوں نے بغاوت کو ختم کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور داماد فرید پاشا کی حکومت کو برطرف کرنے اور سلطان نے تحلیل کی گئی پارلیمنٹ کی جگہ نئی پارلیمنٹ کے قیام کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ سلطان وحید الدین نے اس پر رضامندی ظاہر کی۔

ایک ہی رات میں ہونے والے ٹیلیفونی رابطوں کے تین دن بعد' یعنی 2 نومبر 1919 کو فرید پاشا نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے لوگوں سے کھل کر بات کی اور انہیں بتایا کہ اسے برطانیہ نے چھوڑ دیا تھا، جو ماضی

میں اس کی پشت پناہی کرتا تھا، لیکن اب برطانیہ نے اس سے ہاتھ دھو لیے ہیں۔ اس کے بعد وزیر جنگ علی رداپاشا نے نئی حکومت قائم کی۔ اسے مصطفیٰ کمال کی فتح قرار دیا گیا۔

چنانچہ مصطفیٰ کمال نے ایک کتابچے کے ذریعے امت کے سامنے اعلان کیا کہ قوم پرستوں کی ایگزیکٹو کمیٹی نے علی رضا کی سربراہی میں نئی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ کہ اس نے غیر مشروط طور پر اس کی حمایت کی ہے۔ اس نے عزت مآب سلطان کی بھی تعریف کی جنھوں نے مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ صدارتی اعلان جاری کیا اور داماد فرید پاشا کی حکومت کو معزول کیا۔

تاہم، سلطان اس کتابچے سے ناراض ہوئے اور انہوں نے مصطفیٰ کمال کی امت کی جانب سے کی گئی گفتگو پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ بغاوت تقریباً دوبارہ شروع ہو چکی تھی لیکن مصطفیٰ کمال نے بغاوت کی طرف مائل ہونے والوں کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ سیواس کمیٹی نے حکومت کے ساتھ تصادم سے بچنے کا فیصلہ کیا اور زیادہ تر افسران نے اطمینان کی سانس لی، کیونکہ ان میں سے غالب اکثریت بغاوت کی تجدید کے خلاف تھی اور وہ سب خلیفہ کے وفادار تھے۔

تاہم، مصطفیٰ کمال نے کمیٹی کی تحلیل کو روک دیا، کیونکہ اس کا مقصد ایک جمہوریہ کا قیام اور سلطنت اور خلافت کا خاتمہ تھا، لیکن وہ اس مرحلے میں ایسا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس لیے اسے ایک اور کوشش کرنے کے لیے اس کمیٹی کو ایک ہتھیار کے طور پر برقرار رکھنا پڑا۔ اس نے کمیٹی کی تحلیل کو ٹالنے کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے گھڑنا شروع کر دیے۔ وہ اسے تحلیل نہ کرنے کا بہانہ نہیں ڈھونڈ رہا تھا، بلکہ وہ بظاہر اس کی تحلیل پر راضی ہو گیا تھا لیکن وہ اس عمل کو متاخر کرنے کے لیے تاخیری حربے استعمال کر رہا تھا۔ ان تاخیری حربوں نے اس کے حامیوں کو غصہ دلایا اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس سے کھل کر اظہار کیا کہ اس کمیٹی کا کام جاری رکھنا اب غیر ضروری ہے جب کہ امت نے حکومت کی منظوری کا اعلان کر دیا ہے۔ مصطفیٰ کمال کے حامیوں اور دوستوں میں سے کچھ، جیسے مارشل عزت پاشا، نے اس سے بھی آگے بڑھ کر باآواز بلند احتجاج کیا اور تنبیہ کی، اس اندرونی جھگڑے اور شرمناک

تقسیم کے خاتمے کا پر زور مطالبہ کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کمیٹی کے تسلسل کا مطلب اختلاف کا تسلسل ہے۔ تاہم مصطفی کمال کا ان کو جواب یہ تھا کہ نئی حکومت کو سب سے پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ امت کی طرف سے دیے گئے اعتماد کے قابل ہے اور یہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ مناسب وقت نہ دیا جائے تاکہ وہ اپنا لائحۂ عمل سامنے رکھے اور عملی طور پر اپنے اخلاص کو ثابت کرے۔ اس نے کہا: "فی الحال مسئلہ صرف نئے پارلیمانی انتخابات کی تیاری کا ہو سکتا ہے تاکہ بھاری اکثریت قوم پرست اراکین کی بن جائے۔"

یہ مصطفی کمال کی بغاوت کا پہلا مرحلہ تھا اور یہ اس کے حقائق تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برطانیہ ہی تھا جو اس کی حوصلہ افزائی اور حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ سامسون (Samsun) شہر پر قبضے کی برطانیہ کی کوشش اور اس کے نتیجے میں شہر سے اس کے انخلاء کو واضح طور پر ایک نمائش کی طرح دیکھا گیا جس کا مقصد لوگوں کو مصطفی کمال کے گرد جمع کرنا تھا۔ ورنہ برطانیہ سامسون پر قبضہ کرنے سے کیسے عاجز ہو سکتا تھا جب کہ وہ اُس وقت سلطنتِ عثمانیہ کے قلب میں بیٹھا تھا اور اس کے انتہائی ناقابل تسخیر علاقوں پر قابض تھا۔ اس کے علاوہ، مصطفی کمال کو کس نے بتایا کہ برطانیہ سامسون پر قبضہ کرنے کے لیے پر عزم ہے، جس نے اسے اس قبضے کو روکنے کے لیے رفعت کو بھیجنے کا موقع دیا؟ کیا رفعت کی قیادت میں سو آدمی برطانیہ کو سامسون جیسے شہر پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لیے کافی تھے جس پر وہ قبضہ کرنے کا واقعی عزم کر چکا تھا؟ مزید برآں، کیا سامسون واقعی اس طاقت کی وجہ سے برطانیہ کے قبضے سے بچ گیا تھا جو اس نے بھیجی تھی؟ کیا یہ دانستہ کیا جانے والا ڈرامہ نہیں تھا جس کا مقصد لوگوں کو یقین دلانا تھا کہ مصطفی کمال برطانیہ اور اتحادیوں کے خلاف ہے اور وہ اسے ملک سے بے دخل کرنا چاہتا ہے؟ مزید برآں، یونانیوں کے ساتھ تصادم کیوں ہوا؟ یونانی کمانڈر کو اس کی حکومت کی طرف سے جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس کے آپریشن کو ازمیر تک محدود رکھنے کے لیے تھیں، تو اس نے ان ہدایات سے تجاوز کرتے ہوئے ازمیر کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کیوں کی؟ کیا یہ اس کا ذاتی اقدام تھا یا اسے اتحادی افواج کے جنرل کمانڈر نے ہدایت دی تھی؟ ایسا کیوں ہوا؟ کیا اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ یونانیوں سے لڑ کر جنگی گروہوں (militias) کو قائم کیا جائے اور بغاوت کو قابضین کے خلاف مسلح جدوجہد کا

رنگ دیا جائے تاکہ لوگوں کو قابض اتحادیوں سے لڑنے کے لیے مصطفیٰ کمال کے جھنڈے تلے اکٹھا کیا جائے؟ کیا یہ اقدام بغاوت کی آگ بھڑکانے والا اقدام نہیں تھا؟ اگر برطانیہ خفیہ طور پر بغاوت کو بھڑکانے میں کامیاب رہا تھا، تو کیا برطانیہ کا خلیفہ کو شورشوں پر قابو پانے کے لیے ایک ٹاسک فورس تیار کرنے سے روکنے کا فیصلہ، بغاوت کی واضح حفاظت اور حمایت نہیں تھا؟ 1919 کے موسم گرما میں بغاوت کو کچلنا ممکن تھا اور سلطان نے ایک ٹاسک فورس تیار کرنا شروع کر دی تھی لیکن انگریزوں نے اتحادیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اسے اس بہانے سے روک دیا کہ یہ جنگ بندی کی شرائط کی خلاف ورزی ہے جو افواج کی سبکدوشی سے متعلق ہیں۔ لٰہذا شورشوں پر قابو پانے کے لیے ٹاسک فورس کی تیاری سے کیوں روکا گیا، حالانکہ جنگ بندی کی شرائط میں یہ شرط شامل نہیں تھی کہ فوجیوں کو غیر مسلح یا منقطع کر دیا جائے گا یا ان سے جنگی سازوسامان لے لیا جائے گا۔ اس میں صرف یہ شرط رکھی گئی تھی کہ ترک فوج کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے لیکن سرحدوں کی حفاظت اور ملک میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ضروری فوجی دستے اس شرط سے خارج تھے۔ تو ان کا یہ دعویٰ کہاں سے آیا کہ بغاوت کو کچلنے کے لیے ٹاسک فورس کی تشکیل جنگ بندی کی شرائط کے خلاف تھی؟

اس کے علاوہ، اتحادیوں کی نمائندگی کرنے والا برطانیہ ہی تھا، جس نے مئی 1919 کے آغاز میں دعویٰ کیا کہ مشرقی صوبوں میں شورش شروع ہو گئی ہے اور سلطان سے مطالبہ کیا کہ اس پر قابو پانے کے لیے ایک کمانڈر بھیجیں، اور برطانیہ نے مصطفیٰ کمال کو تجویز کیا۔ اس نے ایسی شورش پر قابو پانے کے لیے ٹاسک فورس بھیجنے کا مشورہ کیوں دیا جس شورش کو انہوں نے خود وضع کیا تھا اور جو موجود بھی نہ تھی، اور پھر خلیفہ کو ایک اعلانیہ بغاوت کو کچلنے کے لیے ٹاسک فورس تیار کرنے سے کیوں روکا، جس کو عالمی پریس اور ٹیلی گرام بھی نشر کر رہے تھے؟ مزید برآں، جب خلیفہ نے برطانیہ کو یہ اختیار دیا کہ وہ یا تو قابض ہونے کی حیثیت سے بغاوت کو ختم کر دیں، یا اسے کچلنے کے لیے خلیفہ کو ایک ٹاسک فورس تیار کرنے کی اجازت دیں، تو برطانیہ نے جواب دیا: "ہم غیر جانبدارانہ موقف اختیار کر رہے ہیں۔" خلیفہ کو ایسی اندرونی بغاوت کو کچلنے کے لیے ٹاسک فورس تیار کرنے سے روکنا کہاں کی غیر جانبداری ہے جو بظاہر

اتحادیوں کے خلاف تھی اور جوان کی ایک ریاست یعنی یونان سے متصادم تھی؟ کیا یہ ایک غیر جانبدارانہ کردار تھا، یا یہ بغاوت کی واضح حمایت اور تحفظ تھا؟

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ سلطان کو بغاوت کو کچلنے کے لیے ٹاسک فورس تیار کرنے سے روک کر ،جب کہ جنگ بندی کی شرائط میں امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری فوج کو تعینات کرنا شامل تھا، اتحادی یعنی انگریز بغاوت کو تحفظ دیناچاہتے تھے اور خلیفہ کو بے اثر کرنا چاہتے تھے تاکہ خلیفہ کو بغاوت کو کچلنے سے روکا جاسکے۔ اس کے باوجود، بغاوت اپنا مقصد حاصل نہ کر سکی اور سلطان کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت قائم نہ کر سکی، یوں یہ بغاوت مجبور ہوئی کہ وہ سلطان سے معاہدہ کر کے ان کے اختیار میں آجائے۔ تاہم، باغی عام لوگوں کو اتحادیوں کے خلاف اکسانے اور یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گئے کہ انہوں نے برطانیہ کو سامسون پر قبضہ کرنے سے روک دیا تھا۔ نیز، یونانیوں کے ساتھ ان کی جھڑپ کے عمل نے ان میں قبضے سے لڑنے کا خیال پیدا کرنے میں مدد کی اور مصطفیٰ کمال کو اس کی قیادت سونپی۔

ملک کو آزاد کرنے کی بنیاد پر لوگوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کرنے میں مصطفیٰ کمال کی کامیابی:

اس لیے مصطفیٰ کمال فاتح کے طور پر ابھرا، کیونکہ وہ ایک ایسی فکر کی بنیاد پر لوگوں کو اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہوا جس پر سب قائل تھے، یعنی اتحادیوں کو ملک سے نکال باہر کرنا اور ان کے قبضے کی آفت سے ملک کی آزادی۔ وہ ان میں یہ خیال پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ قبضے سے لڑنا اور اس کے خلاف اقدامات اٹھانا ممکن ہے۔ اس لیے وہ عوام کی امیدوں اور فوجی افسروں کی تعریف کا مرکز بن گیا، حالانکہ ان سب کو خلیفہ کے بارے میں اس کے ارادوں پر شک تھا، اور وہ ان ارادوں کو خلیفہ کے تقدس کے خلاف سمجھتے تھے، کیونکہ خلیفہ کا عہدہ ان کے لیے مقدس تھا۔ اس لیے لوگوں کی امید مصطفیٰ کمال سے یہ تھی کہ وہ خلیفہ کے ساتھ مفاہمت کرے، تاکہ خلیفہ کا مقدس عہدہ برقرار رہے اور یہ کہ وہ قابض دشمنوں کو نکال باہر کر سکیں۔ یہ خاص طور پر برطانیہ کو سامسون پر قبضہ کرنے سے روکنے اور یونانیوں سے لڑائی کے ذریعے قابضین کے خلاف مزاحمت کرنے کے بعد ہوا تھا۔ اس طرح وہ اس امید سے

چمٹے رہے جس کے پورا ہونے کے لیے وہ مصطفی کمال کو اپنا ہیرو سمجھ رہے تھے اور وہ خلیفہ میں اس بات کا امکان نہیں دیکھ سکے۔

اس لیے سب کی نظریں مصطفی کمال پر تھیں۔ لوگوں کی اکثریت سیاسی سرگرمیوں کی پیچیدگیوں اور اس کی رسائی کو نہیں جان سکتی تھی اور عام آدمی کے لیے انہیں سمجھنا مشکل تھا اور فوجی افسران کے لیے بھی جب تک کہ وہ خود سیاسی سرگرمیاں انجام نہ دیتے۔ لہذا، وہ ان برطانوی چالوں کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ وہ بین الاقوامی تعلقات سے بھی واقف نہیں تھے، اس لیے وہ برطانیہ کی اپنے اتحادیوں کو مال غنیمت سے محروم کرنے کے لیے کی جانے والی مسلسل کوشش کو بھی سمجھ نہیں سکے، چاہے اس کوشش سے ان کا مقصد یہی کیوں نہ ہوتا کہ انہیں مغلوب ریاست کے ہاتھ میں ہی دے دیا جائے، تاکہ وہ خود بین الاقوامی طاقت برقرار رکھے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ترکی کی ساحلی پٹی کے کسی بھی حصے پر اٹلی یا فرانس کا قبضہ مشرق میں برطانوی اثرورسوخ اور بحیرہ روم میں اس کی افواج کو کمزور کر دے گا۔ اس طرح برطانیہ نے اتحادیوں کو کچھ لینے نہیں دیا۔ لوگ یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ برطانیہ نے اطالویوں اور فرانسیسیوں کو اپنی طاقت سے پیچھے نہیں ہٹایا اور نہ ہی اس کے لیے کھلے عام اقدامات کیے بلکہ اس نے ایسا دوسروں کو بھڑکا کر اور چالبازیوں اور فریب کے ذریعے کیا۔

پھر کسی بھی مسلمان نے ابھی تک اس خوف کا اندازہ نہیں لگایا تھا جو کہ تمام ممالک اور بالخصوص برطانیہ کے دل میں خلافت کے موجود رہنے سے متعلق تھا، جسے اُس کے لیے ایک مسلسل خطرہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے مسلمان اس خبیث چال کو نہ سمجھ سکے جو برطانیہ مصطفی کمال کی بغاوت کے ذریعے چل رہا تھا تاکہ خلافت کو مسلمانوں کے ہاتھوں ختم کیا جائے۔ جیسے ہی مصطفی کمال نے قابضوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ترُکی کی قیادت سنبھالی تو وہ پہلے مرحلے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

مصطفی کمال کا انقرہ کو مرکز بنانا

اس کامیابی کو حاصل کرنے کے بعد، مصطفی کمال نے ایک بار پھر قانونی طریقے سے پارلیمنٹ کے ذریعے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ نئے پارلیمانی انتخابات کیلئے تیاریاں جاری تھیں، لیکن وہ پرانی بنیادوں پر تھیں، یعنی ایک عثمانی پارلیمنٹ جو خلیفہ کی حکومت کے تابع ہو گی۔ تاہم، وزیر اعظم علی رضا کمزور تھا اور اُس نے لوگوں کے مصطفی کمال کی طرف جھکاؤ کو محسوس کیا۔ اس لئے اُس نے اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا بہتر سمجھا۔ لہٰذا اس نے بحری وزیر صالح پاشا کو اناطولیہ بھیجا، جہاں اس نے 18 اکتوبر 1919 کو پارلیمانی کمیٹی کے ساتھ ایک اجلاس منعقد کیا جو کہ بعد میں "آماسیہ کانفرنس" (Amasia Conference) کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کافی دن جاری رہا اور صالح پاشا پارلیمانی ممبران اور حکومت کے درمیان اتحاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ سب سے پہلی تجویز جو پیش کی گئی اور جو دونوں جانب سے فوراً منظور ہوئی وہ یہ تھی کہ سلطنت اور خلیفہ کوئی گزند نہ پہنچے۔ استنبول کے نمائندوں نے "ارض روم" اور سیواس کی کانفرنسوں کی تمام قراردادوں کو تسلیم کر لیا۔ پارلیمانی کمیٹی کے تحلیل کرنے کے مسئلہ پر گرما گرم بحث شروع ہو گئی اور جب اس بحث نے شدت اختیار کی تو اس مسٔلہ کو بغیر کسی نتیجے کے چھوڑ دیا گیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ اسے طے کرنے کے لیے نئ پارلیمنٹ کے ممبران کے ملاقات کرنے تک اس بحث کو معطل رکھا جائے۔

اس کے بعد مصطفی کمال انقرہ منتقل ہو گیا تا کہ وہاں قیام کرے اور اس کو اپنے مرکز کے طور پر استعمال کرے۔ اس کے استقبال کیلئے انتظامات کیے گئے اور جس صبح اسے پہنچنا تھا اس دن شہری صبح سویرے ہی اٹھ گئے اور پورا شہر بے چینی سے اُس کا انتظار کرنے لگا۔ کسانوں نے اس کے استقبال میں شریک ہونے کیلئے اپنے کھیت چھوڑ دیئے اور درویش ایک بھرپور قافلہ کی صورت میں نکلے، انہوں نے سبز جھنڈے اٹھا رکھے تھے جن پر قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی مصطفی کمال پہنچا تو لوگوں نے نعرے لگائے، عورتوں کا شور و غل شروع ہو گیا اور فضا تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ وہ شہر میں ایک فاتح کی طرح داخل ہوا اور وہاں قیام پذیر ہوا۔

نئے انتخابات ہوئے اور مصطفیٰ کمال انقرہ کی طرف سے پارلیمنٹ کا نمائندہ منتخب ہو گیا۔ بہت سے پارلیمانی ممبران انقرہ آئے، انہوں نے معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے ایک تمہیدی اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ پارلیمنٹ کو دارالخلافہ میں منتقل کرنا چاہیے اور اس کانفرنس کو ختم کر دینا چاہیئے کیونکہ اس کے ممبران اب سرکاری نمائندے (official deputies) بن چکے ہیں۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے زور دیتے ہوئے اور اصرار کے ساتھ دونوں آراء کی مخالفت کی اور کہا: "کانفرنس جاری رہنی چاہیے جب تک کہ پارلیمنٹ کی انصاف کے ساتھ وابستگی ظاہر نہ ہو جائے اور اس کی پالیسیاں واضح نہ ہو جائیں۔ باقی رہا دارالخلافہ میں اس کی منتقلی تو ایسا کرنے کو صرف پاگل پن ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ مغربی دشمنوں کے رحم و کرم پر ہوں گے کیونکہ برطانیہ ابھی بھی اس ملک پر مسلط ہے اور اتھارٹی آپ لوگوں کے معاملات میں دخل اندازی کرے گی اور آپ لوگوں کو گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے پارلیمنٹ کا انعقاد یہاں انقرہ میں ہونا چاہیے تا کہ وہ آزاد اور خود مختار رہے"۔

لیکن تمام نمائندوں نے اصرار کیا کہ پارلیمنٹ کا انعقاد دارالخلافہ استنبول میں اور پارلیمنٹ ہاؤس میں ہونا چاہیے تا کہ وہاں وہ ملک کے اصل سربراہ اور مسلمانوں کے خلیفہ سلطان وحید الدین کے زیر سایہ ہوں۔ مصطفیٰ کمال خاموش ہو گیا اور اسے قبول کر لیا۔ لیکن وہ خود استنبول نہیں گیا بلکہ انقرہ ہی میں رہا۔ لیکن اس سے پہلے وہ انقرہ کے نمائندوں کے ساتھ ایک پارلیمانی اجلاس کر چکا تھا اور انہیں ضروری ہدایات دے چکا تھا۔ اس نے اُن سے مطالبہ کیا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کو پارلیمنٹ کا سپیکر منتخب کر لیں۔

11 نومبر 1919 کو سلطان کے پیغام سے پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا، پھر پارلیمنٹ کے سپیکر کا انتخاب شروع ہوا۔ پارلیمانی نمائندوں نے مصطفیٰ کمال کو سپیکر منتخب کرنے سے انکار کر دیا بلکہ انہوں نے رؤف بیک کا انتخاب کیا۔ پھر 28 جنوری 1920 کو پارلیمنٹ نے قومی آئین (national charter) پاس کیا جو کہ "میثاق ملی (Milli Charter)" کے نام سے مشہور ہوا جس نے "ارض روم" اور سیواس قراردادوں کی تائید کی۔ اس آئین نے ترک اکثریت والے تمام صوبوں کی مکمل خود مختاری اور آزادی کا مطالبہ کیا، بشمول استنبول کے اور اس کے گرد و نواح میں

بحیرۂ مرمرۃ (Sea of Marmara) کے ساتھ پھیلے علاقوں کے، بشرطیکہ سلطنت کے تمام علاقوں کا فیصلہ استصوب رائے (referendum) کے ذریعہ کیا جائے۔

اس دوران یورپی ممالک نے عثمانی حکومت کو ایک سرکاری خط کے ذریعے مطلع کیا کہ استنبول اور آبنائے (straits) لازمی طور پر سلطان کے زیر اثر رہنے چاہئیں۔ مصطفیٰ کمال کے حامیوں نے اس کو اپنی سیاسی حکمت عملی کی کامیابی شمار کیا اور یہ کہ یورپیوں کے ساتھ بہتر انصاف پر مبنی صلح کی شرائط پر سمجھوتہ ممکن ہوگا۔ اس لیے مصطفیٰ کمال نے علی رضا پاشا کی حکومت گرانے اور اس کی جگہ ایک مکمل قومی حکومت بنانے کیلئے کام شروع کر دیا۔ اس کام کو کرنے کے لیے اس نے نمائندوں سے شدت سے اصرار کیا اور ان پر زور دیا اور اپنی تمام تر کوششیں صرف کیں لیکن پارلیمنٹ کے نمائندے اس سے باز رہے اور مصطفیٰ کمال کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ اس پر اس کو شدید غصہ آیا اور اس کو یقین ہو گیا کہ قانونی طریقہ سے حکومت حاصل کرنے اور خلافت کے نظام کو جمہوری نظام سے بدلنے کا اس کا منصوبہ ناکامی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے طاقت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کیلئے اس نے دوبارہ بغاوت برپا کرنے کا ارادہ کیا۔

دوسرے دور میں مصطفیٰ کمال کی بغاوت کی طرف واپسی

مصطفیٰ کمال نے ہی نئے ممبران کے لیے الیکشن کا مطالبہ کیا تھا اور اسمبلی کی قانونی حیثیت کا اعتراف بھی کیا تھا۔ اس نے منتخب ہونے والے نمائندوں کی حمایت کی تھی اور اسمبلی کی قراردادوں کی پاسداری کا وعدہ کیا تھا، جس نے پچھلی حکومت تحلیل کی تھی اور موجودہ حکومت کو ان مطالبات کے ساتھ قبول کیا تھا کہ ملک کو ایک آئینی حکومت کے ذریعے چلانا چاہیئے۔ ان سب کے باوجود پارلیمنٹ کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کی کوئی امید نظر نہ آنے کے بعد اس نے دوبارہ بغاوت کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کیلیئے اس نے فوجیوں کو مسلح کرنا شروع کیا اور لڑائی کی تیاری کرنے لگا۔ استنبول کی طرف سے پیسہ اور اسلح اسے پانی کی طرح ملنے لگا جس کے متعلق برطانوی اور فرانسیسی ہائی کمشنر مکمل طور پر آگاہ تھے۔ وہ رسمی طور پر اس پر نکتہ چینی بھی کرتے لیکن عمومی طور پر وہ خاموش ہو جاتے اور کچھ ظاہر نہ کرتے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ مصطفیٰ کمال نے غالیبولی (Gallipoli) کے جزیرہ پر، عین برطانوی ہائی کمشنر کی ناک تلے اور ان کی نگرانی کے باوجود، اسلحے اور سازوسامان کے ٹرک جمع کر لیے۔

اتحادیوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع ہو گئی اور بیریا (Biria) پر قبضہ کر لیا گیا اور اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس میں موجود اطالوی فوجی دستوں کو باغیوں نے انخلاء کی اجازت دے دی۔ پھر سیلیسیا (Cilicia) کے مشرقی کنارہ پر حملہ کیا گیا اور وہاں سے فرانسیسی چھاؤنی خالی کروالی گئی۔ لندن اور پیرس نے مکمل طور پر فوجی آپریشن روکنے کا کہا لیکن وہ پھر بھی نہیں رکے بلکہ پہلے کی طرح آگے بڑھتے رہے۔

7 مارچ 1920 کو اتحادیوں نے علی رضا کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تو اُس نے استعفیٰ پیش کر دیا اور اس کی جگہ صالح پاشا نے لے لی جو کہ بحریہ کا وزیر تھا اور جس نے ماضی میں مصطفیٰ کمال کے ساتھ اماسیہ (Amasia) میں معاہدہ طے کیا تھا۔ لہٰذا اُس نے حکومت سنبھالی اور معاملہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

لیکن 10 مارچ 1920 کو لارڈ کرزن (Lord Curzon) نے اپنی اسمبلی (House of Lords) میں ایک تقریر کی جس میں اُس نے کہا: "بیشک اتحادی اس سے زیادہ یورپیوں کی ذلت برداشت نہیں کر سکتے جو انہیں استنبول میں جھیلنی پڑ رہی ہے اور ایسے وقت میں جب عیسایوں پر ظلم کیا جا رہا ہے اور ان کا ہر جگہ قتل عام کیا جا رہا ہے۔

انگریزوں کا استنبول پر قبضہ:

اس تقریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ "گولڈن ہارن"(Golden Horn) کی بندرگاہ برطانوی جنگی جہازوں سے بھر گئی۔ اناطولیہ سے برطانوی ملازمین کو نکال لیا گیا اور باقی ماندہ برطانوی فوجی دستوں کو بھی چھاؤنیوں سے جلداز جلد نکل جانے کے احکامات دیے گئے۔ انقرہ میں رہنے والے انگریزوں نے افرا تفری میں انقرہ چھوڑ دیا۔

استنبول میں پارلیمنٹ کے سپیکر رؤف بیک نے اعلان کیا کہ برطانیہ وطن پرست نمائندوں کو گرفتار کرنے اور داماد فرید پاشا کی حکومت کو بحال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لٰہذا مصطفٰی کمال نے اپنے نمائندوں کو تار بھیجا جس میں اس نے ان کو بھاگ جانے اور اپنے آپ کو انگریز کے حوالے نہ کرنے پر شدت سے زور دیا، لیکن انہوں نے بھاگ جانے سے انکار کر دیا۔

16 مارچ 1920 کو صبح سویرے ہی استنبول پر فوجی قبضے اور شہریوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے گئے۔ اس کام کی ذمہ داری برطانوی جنرل ہنری ولسن(Henry Wilson) کے سپرد کی گئی جو کہ پہلے اتحادی افواج کا کمانڈر انچیف بھی رہ چکا تھا۔

پیرس اور روم اس پر راضی ہو گئے کہ برطانیہ، فرانس اور اٹلی، تینوں حکومتوں کو پابندیاں لگانے میں حصہ لینا چاہئے۔ لیکن صرف برطانیہ نے ہی اپنے بحری دستے بھیجے۔ جب فرانس اور اٹلی نے دیکھا کہ برطانیہ استنبول پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو انہوں نے نئے سرے سے مداخلت شروع کر دی تا کہ عالمی توازن کو برقرار رکھنے کیلئے

برطانیہ کی بے لگام کاروائیوں کو روکیں۔ لہٰذا انہوں نے حکومت میں شرکت کا مطالبہ کیا لیکن برطانیہ نے انہیں ایسا کرنے کا موقع نہ دیا اور سب اکیلے ہی کیا۔

مہلک حملہ

جب مصطفی کمال نے محسوس کیا کہ پورا ماحول اس کے خلاف ہے اور اسمبلی کی اکثریت بھی اس کے خلاف ہے تو وہ اس بند گلی سے نکلنے کا راستہ سوچنے لگا۔ یہ حالات لوزان میں ہونے والی امن کانفرنس کی بحالی کے لیے موافق نہ تھے، کیونکہ اس صورتحال میں برطانیہ کی چاروں شرائط پر عمل درآمد ممکن نہ تھا جس کو برطانوی وزیر خارجہ کرزن نے کانفرنس کی کامیابی کے ساتھ مشروط کیا تھا۔ لہذا اس کے لیے لازمی تھا کہ وہ کوئی ایسا اقدام کرے جس سے وہ ان شرائط کو پورا کر سکے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ قومی اسمبلی سے جمہوریہ کے قیام کی توثیق اور اس کو صدر جمہوریہ منتخب کرنے کا فیصلہ حاصل کیا جائے، اور خلافت کے مکمل خاتمے کی توثیق کے فیصلے کو حاصل کیا جائے۔ چونکہ قومی اسمبلی کی اکثریت اس کے خلاف تھی اور چونکہ اس کے امکانات بہت کم تھے کہ وہ اس کے منصوبوں پر عملدرآمد کرے گی یا اس کے ساتھ آگے بڑھنے پر راضی ہو جائے گی، اس نے اس اسمبلی کو تحلیل کرنے اور نئے انتخابات کروانے کا سوچا جس کے ذریعہ وہ اپنے لوگوں کی اسمبلی تشکیل دے سکے گا جو اس کی حمایت کریں گے، اس کی خواہشات پر عملدرآمد کریں گے اور ان قراردادوں کو منظور کریں جو وہ چاہتا تھا۔

اس لیے اس نے اکثریت حاصل کرنے کی امید سے قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے اور نئے انتخابات کروانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اسمبلی جو انتخابات کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی وہ پرانی اسمبلی کی طرح اس کے خلاف تھی۔ لہٰذا اُس نے قومی اسمبلی کو الجھن میں مبتلا کرنے کیلئے اُس کے خلاف تدابیر کرنا شروع کیں تاکہ اسے اس حالت میں رکھا جائے کہ وہ کوئی بھی کام انجام دینے سے قاصر نظر آئے۔ لہٰذا اس نے ایک سیاسی سازش کی تاکہ ایک بحران پیدا کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ اس نے وزراء کو کنکیا کے نواحی علاقے میں واقع اپنے گھر پر عشائیہ کی دعوت دی جس کے دوران انہوں نے تمام پہلوؤں سے سیاسی صورتحال پر تبادلہ خیال کیا۔ پھر اگلے دن ایک درخواست کی بنیاد پر تمام وزراء نے اس کے مطابق استعفے دے دیے جس پر انہوں نے رات کو اتفاق کیا تھا۔

نئی حکومت کی تشکیل کیلئے قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ نمائندگان کے مابین ہونے والی بحث بہت بڑھ گئی اور جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ ہر ایک نے اپنی رائے مسلط کرنے کی کوشش کی اور اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھا یہاں تک کہ صورتحال انتشار کا شکار ہو گئی۔

دو دن بعد، مصطفیٰ کمال نے اپنے کچھ وفادار دوستوں کے لیے ایک اور عشائیہ پارٹی کی میزبانی کی، جن میں عصمت، فتحی اور کمال الدین شامل تھے اور انہوں نے اس بحران کے بارے میں بات کی جس کا شکار قومی اسمبلی حکومت تشکیل دینے پر اتفاق نہ کرنے کے باعث ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس صورتحال پر تبادلہ خیال کیا اور گفتگو کے اختتام پر مصطفیٰ کمال نے ان کو یہ کہتے ہوئے مخاطب کیا: "وقت آگیا ہے کہ ہم اس افراتفری کا خاتمہ کریں۔ کل ہم جمہوریہ کے قیام کا اعلان کریں گے۔۔ یہ ان تمام مسائل کا حل ہے۔ اس لئے فتحی تمہیں چاہیے کہ کل جس قدر ممکن ہو سکے قومی اسمبلی کے معاملات کو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ بناؤ۔ لہذا تم ممبران کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارو گے۔ اُسی وقت کمال الدین تم یہ تجویز پیش کرو گے کہ مجھے (مصطفیٰ کمال) کو معاملات کی باگ دوڑ سنبھالنے کی دعوت دی جانی چاہئے تاکہ اسمبلی کو اس بحران سے بچایا جا سکے"۔

اگلے دن سب اُس پر عمل کرنے کو تیار تھے جس پر انہوں نے اتفاق کیا تھا۔ اسمبلی جمع ہوئی اور شور شرابہ شروع ہو گیا۔ قریب تھا کہ نمائندے ایک دوسرے کے دست و گریبان ہو جاتے۔ نمائندگان کے مابین اس شور وغُل میں کمال الدین نے تجویز پیش کی کہ مصطفیٰ کمال کو حکومت تشکیل دینے کی دعوت دی جائے۔ نمائندوں نے اس کو قبول کر لیا اور اِس کے ساتھ ہی اپنے مابین تمام تنازعات کو بھول گئے۔ تاہم مصطفیٰ کمال نے پہلے اُن کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اسے ایک نیا پیغام بھیجا جس میں اسمبلی نے حکومتی بحران حل کرنے میں اپنی ناکامی کو تسلیم کیا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے شرط لگائی کہ اگر وہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ حکومت تشکیل دے تو اسمبلی اس کی رائے کو بغیر کسی حیل وحجت کے قبول کرے گی، جس پر وہ راضی ہو گئے۔

29 اکتوبر 1923 کو قومی اسمبلی نے ایک اہم اجلاس منعقد کیا، مصطفٰی کمال اسٹیج پر چڑھا اور اس نے تقریر کی جس میں اس نے ترکی کو جمہوریہ (Republic) میں تبدیل کرنے کا اعلان کیا۔ اپنی تقریر میں اس نے کہا: "آپ لوگوں نے میرے لیے پیغام بھیجا ہے کہ میں اس بحرانی صورتحال سے نجات دلاؤں۔ تاہم یہ بحران ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اس بحران کی جڑ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے حکومتی نظام میں موجود ایک بنیادی نقص کی وجہ سے ہے۔ قومی اسمبلی بیک وقت قانون سازی (legislative) اور انتظامیہ (Executive) کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے۔ آپ لوگوں میں سے ہر ایک نمائندے کو چاہیئے کہ وہ لازمی طور پر ہر منظور ہونے والی حکومتی قرارداد میں مداخلت کرے اور ہر حکومتی ادارے اور وزارتی فیصلے پر اُنگلی اُٹھائے۔ حضرات! اس صورتحال میں کوئی وزیر اپنی ذمہ داری نہیں نبھا سکتا اور نہ کوئی عہدہ قبول کر سکتا ہے۔ آپ لوگوں کو اس بات کا ادراک کرنا ہوگا کہ ایسی حکومت کا چلنا ناممکن ہے جسے ان بنیادوں پر تعمیر کیا جائے۔ اور اگر ایسی حکومت تشکیل پا بھی جائے تو وہ حکومت نہ ہوگی بلکہ انارکی ہو گی۔ ہمیں اس موجودہ صورتحال کو بدلنا ہوگا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ترکی کو ایک جمہوریہ بننا چاہیئے جس کا ایک منتخب شدہ صدر ہو"۔

اس خطرناک فیصلے سے نمائندے ہکا بکا رہ گئے اور کچھ بولنے کے قابل نہ رہے کیونکہ وہ اس کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ جب رائے شماری شروع ہوئی تو اس میں چالیس فیصد سے بھی کم نمائندگان نے حصہ لیا۔ بہرحال پہلے سے تیار شدہ فیصلہ کہ ترکی کو ایک جمہوریہ (republic) میں بدل دیا جانا چاہیئے، منظور ہو گیا اور مصطفٰی کمال کو ترکی جمہوریہ کا پہلا صدر منتخب کر لیا گیا۔ تب وہ خلافت کو منہدم کرنے اور ملک کو سیکولر بنانے کیلئے سرگرم ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی سرگرمیوں کو محسوس کیا تو رائے عامہ اس کے خلاف ہو گئی۔ ہر جگہ یہ بات پھیل گئی کہ انقرہ کے نئے حکمران کافر ہیں۔ خطیبوں اور مبلغین نے مصطفٰی کمال پر کڑی تنقید شروع کر دی۔ پمفلٹ اور تصویری خاکے تقسیم کیے گئے جو مصطفٰی کمال کے سخت خلاف تھے۔ پھر بہت سے نمائندے اور ملک کے نمایاں لوگ انقرہ کو چھوڑ کر استنبول پہنچنے لگے تا

کہ خلیفہ عبدالمجید کے گرد جمع ہو سکیں۔ پورے ترکی میں فضاء اس کے خلاف ہو گئی۔ اس کے جواب میں اس نے اپنے ہمنواؤں کو جیتنے کی کوشش شروع کردی تاکہ ان حملوں کا خاتمہ کیا جاسکے۔

اس صورتحال کے دوران برطانیہ نے اسے خلافت سے وابستہ افراد کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ایک آلہ فراہم کیا۔ مصطفی کمال کے خلاف اس تحریک کے عروج پر دو ہندوستانی مسلمان رہنماؤں آغاخان اور امیر علی نے مسلمانان ہند کی جانب سے ایک احتجاجی پیغام بھیجا جس میں ان دونوں نے عثمانی خلیفہ یعنی خلیفۃ المسلمین کی عظمت کے احترام کا مطالبہ کیا۔ آغاخان اسماعیلی فرقے کا پیشوا تھا اور ترکی کے ساتھ ساتھ بہت سے علاقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ برطانیہ کا دوست اور ان کا ایجنٹ ہے۔ لہٰذا پیغام کا متن انقرہ حکومت تک پہنچنے سے پہلے ہی استنبول کے اخبارات میں چھپ گیا۔ پھر مصطفی کمال آغاخان کا ماضی کھنگالنے لگا۔ معلوم ہوا کہ آغاخان برطانیہ میں رہتا تھا، اس نے اپنے گھوڑے برطانوی ریس کورس میں دوڑائے تھے اور وہ برطانوی سفیروں اور سیاستدانوں میں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ برطانیہ نے عالمی جنگ کے دوران پروپیگنڈہ کے ذریعہ اُس کی حیثیت کو بلند کیا تھا یہاں تک کہ اس کو ہندوستانی مسلمانوں کا رہنما سمجھا جانے لگا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر انگریز اسے ترکی کے سلطان کو دھمکانے کے لیے استعمال کر سکیں، وہ انگریزوں کے مہروں میں سے ایک مہرہ تھا۔ اس لیے وہ ایک برطانوی کٹھ پتلی تھا۔

مصطفی کمال ایک کاری ضرب لگانے اور خلیفہ کے خلاف عوام کی رائے عامہ کو بھڑکانے میں بہت متحرک ہو گیا۔ وہ لوگوں سے کہا کرتا تھا: "جب برطانیہ ایک مکار اور پکا دشمن، یونان کے راستے ترکی کو تباہ کرنے میں ناکام رہا، تو اس نے اپنی پرانی چالوں کا سہارا لیا۔ لہٰذا اس نے اپنے کٹھ پتلی آغاخان کو آمادہ کیا کہ وہ خلیفہ کی حمایت کرے اور ترکی کو دو خیموں میں تقسیم کردے"۔ اس کے بعد اس نے قومی اسمبلی میں جوش و خروش پیدا کرنے کا آغاز کیا اور اس کے نتیجے میں نمائندگان میں سے ممتاز افراد خلیفہ، علماء اور مخالف رہنماؤں کے خلاف شدید حملے شروع کرنے کے لیے تیزی سے لپکے۔ انہوں نے اس بل کی بھی توثیق کی جس میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی تھی کہ جمہوریہ کی کسی قسم کی مخالفت اور معزول شدہ سلطان کی طرف کسی بھی قسم کے جھکاؤ کو غداری سمجھا جائے گا جس پر سزائے موت ہو گی۔

جب بعض نمائندوں نے سفارتی پہلو سے خلافت کے فوائد پر روشنی ڈالی تو مصطفی کمال کے ہمنواؤں نے چیختے چلاتے ہوئے اور احتجاج کرتے ہوئے اُن کو خاموش کرانے کی کوشش کی۔ پھر مصطفی کمال کھڑا ہوا اور کہنے لگا، "کیا ایسا نہیں ہے کہ خلافت، اسلام اور علماء کی وجہ سے ترکی کے لوگ گزشتہ پانچ صدیوں سے لڑ رہے ہیں اور اپنی جانیں گنوا رہے ہیں؟ اب وقت آگیا ہے کہ ترکی اپنے مفادات کو طرف متوجہ ہو، ہندوستان والوں اور عربوں کو نظر انداز کرے اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے علاقوں کی قیادت سے بچائے"۔

پھر اس نے فوج کی جانچ پڑتال کرنے کی ٹھانی تاکہ اس بات کا پتہ لگائے کہ وہ کس حد تک خلافت کے انہدام اور دین کی ریاست سے علیحدگی کے حق میں ہے۔ اس کے لیے اُس نے ازمیر میں فوج کی سالانہ مشقوں میں شرکت کی اور وہاں کئی دن گزار کر فوزی اور عصمت کے ساتھ صورتحال کا جائزہ لیا اور نچلی سطح کے افسروں اور سپاہیوں کے بارے میں تحقیق کی۔ اُس نے اس معاملہ میں سخت مخالفت پائی اور کسی قابل اطمینان نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔

اس نے پھر کئی راتیں صرف کر کے اس صورتحال کا ہر زاویے سے جائزہ لیا اور آخر کار اس نے دہشت زدہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مصطفی کمال نے ایک دن اسمبلی میں سے ایک مخالف نمائندے کا انتخاب کیا جب اس نمائندے نے ایک اجلاس میں شدید مخالفت کا اظہار کیا اور کسی کو حکم دیا کہ اسے اسی رات اپنے گھر جاتے ہوئے قتل کر دے۔ ایک اور نمائندہ نے تقریر کی اور اس میں اس نے خلیفہ کی تائید کی تو مصطفی کمال نے اس کو دوبارہ منہ کھولنے پر پھانسی کی دھمکی دی۔ پھر اُس نے استنبول سے رؤف کو طلب کیا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ عوامی جماعت (People's Party) کی مرکزی کمیٹی کے سامنے اس (مصطفی کمال) سے اور جمہوریہ سے وفاداری کی بیعت لے اور ایسا نہ کرنے پر اُس کو جماعت اور کمیٹی سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ اُس نے استنبول کے گورنر کو بھی ایک سخت حکم بھیجا جس میں اس نے نماز کے دوران خلیفہ کے گرد شاہانہ پروٹوکول ختم کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے خلیفہ کا رُتبہ انتہائی حد تک کم کر دیا اور خلیفہ کے پیروکاروں کو اُسے چھوڑنے کا حکم دیا۔

اس خوف کی فضااوراس پر پیگنڈہ اور افواہوں کے دوران عظیم قومی اسمبلی(Greater National Assembly) نے ایک اجلاس طلب کیا۔ یکم مارچ 1924 کو یہ اجلاس شروع ہوا۔افتتاحی تقریر ہی خلافت کے خاتمہ کی ضرورت پر زور دے رہی تھی۔ جس پر سخت تنقید ہوئی۔

مصطفی کمال نے اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جو کہ خلافت کے خاتمے، خلیفہ کو ملک بدر کرنے اور دین کو ریاست سے جدا کرنے پر مشتمل تھا۔اس نے نمائندوں کو مخاطب کیا جو غصہ سے بھرے ہوئے تھے اور ان سے کہا: " ہمیں ہر قیمت پر خطرات سے دوچار جمہوریہ کی حفاظت کرنی ہے اور اسے ٹھوس سائنسی بنیادوں پر استوار کرنا ہے۔ خلیفہ اور آل عثمان کے بقایاجات کو چلے جانا چاہیے، دقیانوسی دینی عدالتوں اور قوانین کو جدید عدالتوں اور قوانین سے بدل دینا چاہیے،اور دینی مدارس کو حکومت کے لادینی(Secular) سکولوں کے لیے جگہ چھوڑ دینی چاہیے"۔

گرما گرم بحثیں ہوئیں اور تلخ جھگڑے ہوئے، لیکن ان سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ دوسرے دن اسمبلی اس قانون پر نظر ثانی کیلئے دوبارہ اکھٹی ہوئی۔ یہ اجلاس اگلے دن صبح ساڑھے چھ بجے تک زبردست جھگڑے اور مسلسل بحث کے ساتھ جاری رہا۔

مارچ 1924 کے تیسرے روز کی صبح اعلان کیا گیا کہ گریٹر قومی اسمبلی(Greater National Assembly) نے خلافت کے خاتمے اور دین کو ریاست سے الگ کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ اسی رات مصطفی کمال نے استنبول کے گورنر کو یہ حکم نامہ بھیجا کہ خلیفہ عبدالمجید اگلے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی ترکی سے چلے جائیں۔ لہٰذا وہ آدھی رات میں پولیس اور فوج کے ایک دستے کے ساتھ خلیفہ کے محل گیا اور خلیفہ کو ایک سوٹ کیس کے ساتھ جس میں چند کپڑے اور پیسے تھے، گاڑی میں سوار ہونے پر مجبور کیا جو اسے سرحدوں کے پار سوئزرلینڈ کی طرف لے گئی۔ دو دن بعد، مصطفی کمال نے تخت کے تمام شہزادوں اور شہزادیوں کو جمع کیا اور انہیں ملک سے جلاوطن کر دیا۔ تمام مذہبی فرائض کو منسوخ کر دیا گیا اور مسلمانوں کے اوقاف(وقف کیے گئے اموال اور

جائیدادیں) ریاست کی ملکیت بن گئیں، اور مذہبی اسکولوں کو وزارت تعلیم کے زیرِ اہتمام سول اسکولوں میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس طرح مصطفی کمال نے ان چاروں شرطوں کو پورا کر دیا جس کا برطانیہ کے وزیر خارجہ کرزن (Curzon) نے مطالبہ کیا تھا اور اَب صلح کانفرنس کے انعقاد اور کامیابی کے راستے میں کوئی رُکاوٹ باقی نہ رہی تھی۔ لہٰذا 8 مارچ 1924ء کو ترکی کے وزیر خارجہ اور ترک وفد کے سربراہ عصمت پاشا نے کانفرنس کو خط کے ذریعے یہ درخواست کی کہ مذاکرات دوبارہ شروع کیے جائیں اور اتحادی اس پر راضی ہو گئے۔ 23 اپریل 1924ء کو لوزان کانفرنس کا دوبارہ آغاز ہوا اور کانفرنس میں شریک نمائندوں نے شرائط صلح پر اتفاق کیا۔ 24 جولائی 1924ء کو لوزان معاہدہ پر دستخط کیے گئے۔ تمام ملکوں نے ترکی کی آزادی کو تسلیم کر لیا، برطانیہ استنبول اور آبناؤں سے نکل گیا اور ہارنگٹن نے ترکی چھوڑ دیا۔ اس کے نتیجہ میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک نمائندہ نے ہاؤس آف کامنز میں ترکی کی آزادی کو تسلیم کرنے پر کرزن سے احتجاج کیا۔ کرزن نے اس کو جواب دیتے ہوئے کہا: "درحقیقت بات یہ ہے کہ ترکی تباہ ہو چکا ہے اور اب دوبارہ نہیں اٹھ سکتا کیونکہ ہم نے اس کی حقیقی طاقت کو ختم کر دیا ہے، یعنی خلافت اور اسلام"۔

اس طرح خلافت کا خاتمہ کیا گیا۔ خلافت مکمل طور پر تباہ ہو گئی اور اسلام بھی ریاست کے آئین، امت کی قانون سازی کے ماخذ اور ایک نظام حیات کے طور پر باقی نہ رہا۔ اور یہ سب برطانیہ کے ہاتھوں اس کے وفادار ایجنٹ مصطفیٰ کمال کے ذریعے ہوا۔ اس لیے جب دانشمند اور مخلص لوگ یہ کہتے ہیں کہ برطانیہ تمام کافر ممالک کا سرغنہ ہے تو ان کا مطلب بالکل یہی ہوتا ہے کیونکہ وہ درحقیقت کفر کا سردار ہے اور اسلام کا شدید ترین دشمن ہے۔ مسلمانوں کو یقیناً چاہیے کہ وہ برطانیہ سے نفرت کو اپنے دلوں میں جگہ دیں اور اُن سے انتقام لینے کے لیے تمنا رکھیں۔ برطانیہ روئے زمین پر رہنے والے تمام مسلمانوں اور خاص طور پر تُرکی کے مسلمانوں سے اسلام اور خلافت کا سایہ چھیننے میں صرف مصطفیٰ کمال کے ذریعہ کامیاب ہوا۔ اس طرح کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کے مطابق حکمرانی ختم ہو گئی اور

غیر اللہ کے ذریعے حکمرانی باقی رہ گئی، کفر کی حکمرانی باقی رہ گئی۔ صرف طاغوت کی حکمرانی رہ گئی جو تمام لوگوں پر غالب تھی اور پوری دنیا میں نافذ تھی۔

اہم مسائل اور زندگی و موت کا اقدام

یہاں کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ "کیا کفار کے لیے یہ اتنا آسان تھا کہ وہ خلافت کا خاتمہ کردیں اور اسلام کو سیاسی منظر نامے سے ہٹادیں، جبکہ مسلمان کروڑوں میں ہونے کے باوجود اپنے دین اور اپنے سیاسی وجود کا دفاع نہ کریں؟"

اس کا جواب ہے: "ہاں! کفار کے لیے خلافت کا تختہ پلٹ دینا اور اسلام کو سیاسی منظر نامے سے مٹادینا اتنا ہی آسان تھا اور مسلمانوں نے اس کا دفاع نہیں کیا حتیٰ کہ وہ آخری دم تک بھی نہ لڑے جیسا کہ شکست کھانے والا جنگ کا میدان چھوڑنے سے پہلے تک کرتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کیونکہ اُمت نے ان معاملات کو زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں سمجھا کہ جس کے لیے پھر اس مناسبت سے اقدامات اٹھائے جاتے۔ لہٰذا اُمت کو اس جان لیوا حملے کا سامنا ہوا جس کو پلٹانے کی اس نے پوری کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُمت نے جو ہوا اس کو ایک ایسا اہم مسئلہ سمجھا نہیں کہ جس پر اُس کی بقاء اور موت منحصر ہو۔ لہذا اُمت نے اس آفت کو اس اہمیت سے نہ دیکھا جس اہمیت سے وہ ان مسائل کو عموماً دیکھتی تھی جن پر اس کی بقاء کا انحصار ہو۔ نتیجتاً، اُمت نے اس آفت کو زندگی اور موت جیسے فوری مسئلے کے طور پر حل نہیں کیا۔ اس کے نتیجے میں کفار خلافت کا تختہ پلٹنے اور اسلامی نظام کے وجود کو مٹا دینے میں کامیاب ہوئے۔

جبلتِ بقاء اس بات کو دنیا کی ہر قوم اور اس زمین کے ہر باشندے پر لازمی ٹھہراتی ہے کہ ان کے کچھ ایسے اہم مسائل ہوں جن کے لیے وہ قوم یا لوگ بغیر کسی جھجھک، مکالمے یا بحث کے بخوشی اور بھرپور جوش و خروش کے ساتھ اپنی جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ ہوں۔ یہ مسائل وہ ہوتے ہیں جو یا تو مر مٹ جانے یا زندہ رہنے سے تعلق رکھتے ہیں یا یہ لوگوں کے نیست و نابود ہو جانے یا اُن کی بقاء کی حفاظت سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ اقدامات تمام لوگوں کے ہاں منفرد اور ایک سے ہوتے ہیں اور اِن کے لیے اُٹھائے جانے والے اقدامات بھی تمام لوگوں کے ہاں تقریباً ملتے جلتے ہوتے ہیں کیونکہ ان سے حقیقتاً زندگی کو خطرہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مسائل بھی ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات بھی۔ تاہم ضروری نہیں کہ جبلتِ بقاء سے متعلق معاملات تمام اہم مسائل کو اکٹھا کیے ہوں اور نہ ہی ایسا ہے کہ

تمام اہم مسائل جبلتِ بقاء سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ دیگر بہت سے اہم مسائل ہیں جن کا تعلق جبلتِ تدین (Spiritual Instinct) اور جبلتِ نوع (Instinct Procreation) سے ہوتا ہے۔ البتہ لوگ ان مسائل میں زندگی سے متعلق اپنے نکتۂ نظر کے لحاظ سے اختلاف رکھتے ہیں لہذا وہ اُن کے لیے اُٹھائے جانے والے اقدامات میں بھی اختلاف رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان معاملات کو جو چیز اہم بناتی ہے وہ زندگی سے متعلق مخصوص نقطہ نظر ہے۔ چنانچہ وہ اس میں اختلاف رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اقدامات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا لوگوں اور قوموں کے درمیان کچھ اہم مسائل ان کے زندگی سے متعلق نکتۂ نظر کے مختلف ہونے کے باعث مختلف ہوتے ہیں ۔ مسلمان ایک اُمت ہیں اور بلاشبہ اُن کے بہت سے مسائل انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ اُمت کے اہم مسائل، چاہے وہ جبلتِ بقاء سے متعلق ہوں یا جبلتِ تدین یا جبلتِ نوع سے متعلق، وہ زندگی کے متعلق اُن کے نقطہ نظر کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اور اُن کے زندگی سے متعلق نقطۂ نظر کا تعین صرف اسلام سے ہوتا ہے۔ لہذا وہ اسلام ہی ہے جو ان کے اہم مسائل کا تعین کرتا ہے اور اس بات کا بھی کہ اُن کے لیے کون سے اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔

اسلام نے لوگوں کو واضح کیا ہے کہ کون سے مسائل انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور اُن سے متعلق زندگی و موت پر مبنی اقدامات اُٹھانے کو فرض قرار دیا ہے۔ اس لیے مسلمان اپنے اہم مسائل کا تعین اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔ لہذا جس معاملے کو اسلام نے اہم ترین قرار دیا ہے، مسلمانوں کو بھی اسے ویسے ہی دیکھنا ہے۔ اسی طرح اُن کے پاس ان مسائل کے لیے زندگی اور موت پر مبنی اقدامات اٹھانے کے علاوہ کوئی اختیار نہیں، اس لیے کہ اسلام نے جب اہم ترین مسائل کا تعین کیا تو ساتھ یہ بھی متعین کر دیا کہ مسلمانوں کو ان کیلئے کیا اقدامات اٹھانے چاہییں۔

اسلام کو اُن معاملات کا سامنا کرنا ہی تھا جس سے اُسے خطرات لاحق تھے اور مسلمانوں کو بھی اُن معاملات سے نبرد آزما ہونا ہی تھا جس سے اُن کے وجود کو خطرہ تھا۔ یہ واضح ہے کہ ہر تحریک کو ایسے معاملات کا سامنا ہوتا ہے جو اس کے وجود کے لیے خطرہ ہوتے ہیں، خاص طور پر اصلاح کی تحریکوں کو اور بالخصوص برحق تحریکوں کو۔ جب سے اسلام کا سورج طلوع ہوا ہے، کفر اور اسلام کے مابین شدید کشمکش جاری ہے۔ یہ کشمکش اسلام اور کفر کے انجام سے متعلق

ہے۔جب سے مدینہ میں ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے تب سے ان اہم ترین معاملات کے دفاع کے لیے فکری کشمکش میں خونی کشمکش بھی شامل ہو گئی ہے۔ لہذا مسلمانوں کے لیے اہم معاملات کا وجود نا گزیر اور لازمی تھا اور ان کی خاطر زندگی اور موت کے اقدامات لینا بھی اُتنا ہی ضروری تھا۔ یہ وہ معاملہ ہے جس وجہ سے جہاد کو اہم ترین فرائض میں شامل کیا گیا جس کے متعلق معاذ ابن جبلؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: **«رأس الأمر الإسلام، وعموده الصلاة، وذروة سنامه الجهاد»** یعنی **"تمام معاملات کا سردار اسلام ہے، نماز اس کا ستون ہے اور اس پہاڑ کی چوٹی پر جہاد ہے"** (احمد، ترمذی، نسائی)۔اور یہ وہ معاملہ ہے جس کی وجہ سے جہاد قیامت تک قائم رہنے والا ہے جیسا کہ انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا **«والجهاد ماض مذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال، لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل»** یعنی **"جب سے مجھے اللہ تعالی نے بھیجا ہے تب سے جہاد جاری ہے یہاں تک کہ میری امت کا آخری طبقہ دجال سے قتال کرے گا۔ اس (جہاد) کو کسی جابر کا جبر یا کسی عادل کا عدل ختم نہ کر سکے گا"** (ابو داؤد) اور فرمایا **«الجهاد ماض مع البر والفاجر»** یعنی **"جہاد ہر نیک و بدکار کے ساتھ جاری رہے گا"**۔اس لیے مسلمانوں نے اپنے اہم معاملات کے دفاع میں ایک لمحہ کی بھی سستی نہیں دکھائی اور نہ ہی کبھی کسی بھی اہم معاملے کے سلسلہ میں زندگی اور موت کے اقدامات اٹھانے میں ہچکچاہٹ سے کام لیا ہے۔

اس لیے جب انہیں کسی ایسے مسئلہ کا سامنا ہوا جس سے بحیثیتِ اُمت یا صلیبی جنگوں کے دوران ریاست کے طور پر ان کے انجام کو خطرہ لاحق ہوا تو مسلمانوں نے وہ اقدامات اٹھائے جو زندگی اور موت کے لیے ضروری تھے۔ لہذا وہ کافر صلیبیوں کے خلاف ایک گھمسان کی جنگ میں ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے کے لیے مصروف ہو گئے۔ مسلم امت اُس جان لیوا حملے کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئی جس سے اُس کے وجود کو خطرہ تھا۔اسی طرح جب منگولوں نے اسلامی سرزمین پر حملہ کیا تو مسلمانوں کا یہی رد عمل رہا۔اُمتِ مسلمہ نے اس یلغار کو اپنے وجود کیلئے خطرہ کا معاملہ سمجھا تو

اس کے لیے زندگی و موت کے اقدامات اٹھائے اور مسلمان منگولوں کے ساتھ ایک ایسی جنگ میں مصروف ہوئے جس میں انہوں نے کوئی دنیاوی مفادات چاہے بغیر اپنی جانیں قربان کیں، یہاں تک کہ فتحِ مبین ان کی ہوئی۔

لہٰذا مسلمان اپنے اہم ترین مسائل کا ادراک کیا کرتے تھے اور ان کے لیے وہ اقدامات اٹھاتے جو اُن پر فرض تھے، جو کہ زندگی اور موت کے اقدامات تھے۔ ایسا اس لیے تھا کہ اسلام نے جن معاملات کو اہم ترین بتایا تھا مسلمانوں نے اُنہیں یقینی حقائق کے طور پر لیا تھا اور انہیں مضبوطی سے تھاما تھا اور اس خطرے کا ادراک ان پر بہت واضح تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کے لیے یہ ناقابلِ تصور تھا کہ اُن کو کسی ایسی صورتحال کا سامنا ہو جس سے اُن کے وجود کو خطرہ لاحق ہو اور انہوں نے اُس کے لیے زندگی اور موت پر مبنی اقدامات نہ اٹھائے ہوں جن کو اسلام نے اُن پر فرض قرار دیا ہے۔ نہ ہی مسلم اُمت اور نہ ہی اسلامی ریاست ماضی میں کبھی اپنے اہم ترین مسائل کے ادراک میں یا انہیں جاننے میں ناکام رہی۔ البتہ جب اسلام کے متعلق سمجھ بوجھ اُس سے انحراف کی حد تک کمزور ہو گئی اور جب تقویٰ کا درجہ کفرِ بواح پر بھی خاموشی اختیار رکھنے کی حد تک کمزور پڑ گیا تو یہ اہم معاملات اپنے اہم ہونے کا ادراک کھو بیٹھے، اور اُن کے لیے زندگی اور موت پر مبنی اقدامات نہ اٹھائے گئے۔ اس کے نتیجہ میں اُن کے وجود پر خطرات منڈلانے لگے اور مسلمان اس خطرے کو پیچھے دھکیلنے کے لیے اپنے خون اور اپنی جانوں جانثاری کے ساتھ قربان کرنے میں ناکام ہو گئے۔ لہٰذا خلافت تباہ ہو گئی، اسلام کا نظام ختم ہو گیا اور پوری مسلم اُمت کو نیست و نابود ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ اہم مسائل کا ادراک اسلامی نقطۂ نظر سے کیا جائے جیسے اسلام نے قرآن و سنت میں بیان کیا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے لازمی اقدامات کا ادراک کیا جائے جن کو اٹھائے جانے کی ضرورت ہے جس کی جانب قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث نے واضح نشاندہی فرمائی ہے۔ صرف اسی صورت میں ہی اہم ترین مسائل اور ان کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات کے بارے میں آگاہی پیدا ہو گی اور اُن کا نظر انداز ہو جانا ناقابلِ تصور ہو گا۔

اسلام کی نظر میں اہم ترین مسائل

اگر کوئی کتاب وسنت کا مطالعہ کرے تو وہ یہ جان لے گا کہ اسلام نے اہم ترین مسائل کا واضح طور پر تعین کیا ہے اور اس نے ان لازمی اقدامات کا بھی تعین کیا ہے جن کو ایک زندگی اور موت کا معاملہ ہونے کے تحت اٹھایا جاتا ہے۔ اسلام نے، مثال کے طور پر، ایک فرد یا ایک جماعت کی جانب سے اسلام سے ارتداد کو ایک اہم مسئلہ قرار دیا ہے اور اس کے لیے اٹھائے جانے والے اقدام کو زندگی اور موت کا معاملہ قرر دیا ہے۔ یعنی یا تو مجرم توبہ کرے یا پھر موت کا سامنا کرے۔ لہٰذا اسلام نے معاملہ کا تعین بھی کیا ہے اور اقدام کا بھی۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«من بدل دينه فاقتلوه»** یعنی **"جس نے اپنا دین بدلا تو اس کو قتل کر دو"** (بخاری) اور عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا **«لا يحل دم امرئ مسلم يشهد أن لا إله إلا الله وأني رسول الله إلا بإحدى ثلاث: الثيب الزاني، والنفس بالنفس، والتارك لدينه المفارق للجماعة»** یعنی **"کسی مسلمان آدمی کا خون، جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، حلال نہیں مگر تین صورتوں میں: شادی شدہ زانی، کسی کو قتل کرنے والا اور مرتد ہو کر جماعت کو چھوڑ دینے والا"** (مسلم)۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے ہاں ایک غالب تصور رکھتا تھا اور یہ ایسی حقیقت تھی جس پر مسلمان سختی سے عمل پیرا تھے۔

مسلمان اس حکم کو نافذ کرتے تھے جس کے نتیجہ میں اگر مرتد توبہ نہیں کرتا تھا تو اس کو قتل کیا جاتا تھا۔ صحابہؓ نے ایسا رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں یمن میں کیا۔ انہوں نے یہ اس کے بعد بھی کیا اور اُن کے بعد آنے والوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے کہا **«اذهب إلى اليمن، ثم اتبعه معاذ بن جبل. فلما قدم عليه ألقى له وسادة وقال: انزل، وإذا رجل عنده موثق، قال: ما هذا؟ قال: كان يهودياً فأسلم ثم تهود، قال: لا أجلس حتى يقتل. من رجع عن دينه فاقتلوه»** یعنی "یمن جاؤ، پھر ان کے پیچھے معاذ بن جبل کو بھیجا۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو

انہوں نے ان کے لیے تکیہ رکھا اور کہا تشریف رکھیے۔ ان کے پاس ایک بندھا ہوا آدمی تھا۔ انہوں نے کہا یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ یہودی تھا تو مسلمان ہو گیا پھر یہودی ہو گیا ہے۔ معاذؓ نے کہا میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ اس کو قتل نہیں کیا جاتا۔ جو اپنے دین سے پھر جائے اس کو قتل کر دو" (بخاری)۔ سنن ابی داؤد نے اس واقعہ کو ایسے روایت کیا ہے: «**فأتي أبو موسى برجل قد ارتد عن الإسلام فدعاه عشرين ليلة أو قريباً منها، فجاء معاذ فدعاه فأبى فضرب عنقه**» یعنی "ایک مرتد شخص جو اسلام سے پھر گیا تھا ابو موسی کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے اسے توبہ کرنے کو کہا۔ تقریباً ۲۰ راتوں تک یہ سلسلہ رہا۔ معاذؓ آ گئے اور اسے توبہ کرنے کو کہا۔ اُس نے انکار کیا تو آپ نے اُس کی گردن مار دی۔"

الدار قطنی اور بیہقی نے ایک روایت نقل کی ہے: «**أن أبا بكر استتاب امرأة يقال لها أم قرفة كفرت بعد إسلامها فلم تتب فقتلها**» یعنی "ابو بکرؓ نے ایک عورت کو توبہ کرنے کے لیے بلایا جسے اُمِ قرفہ کہا جاتا تھا جو اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا تو آپؓ نے اس کو قتل کر دیا"۔ اور جب عرب کے بہت سے قبیلوں نے فرضیت زکوٰۃ کا انکار کر دیا تو ابو بکرؓ نے اسے اسلام سے ارتداد قرار دیا۔ لہٰذا آپؓ نے ان کے خلاف تلوار بے نیام کی اور ان سے لڑتے رہے حتیٰ کہ ان کو اسلام کے دائرے میں لوٹا دیا۔

کتاب الفتح میں عبداللہ بن شریک العامری اپنے والد سے نقل کرتے ہیں: "حضرت علیؓ سے کہا گیا: مسجد کے دروازہ پر کچھ لوگ ہیں وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ آپ ان کے رب ہیں۔ آپؓ نے ان کو بلایا تو ان سے کہا ہلاکت ہو تمہارے لیے تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ ہمارے پروردگار ہیں، ہمارے خالق ہیں، ہمارے رازق ہیں۔ انہوں نے کہا: تمہارے لیے ہلاکت ہو میں تو تمہاری طرح کا بندہ ہوں۔ ویسے ہی کھانا کھاتا ہوں جیسا کہ تم کھاتے ہو۔ اور پیتا ہوں جیسا کہ تم پیتے ہو۔ اگر میں نے اللہ کی اطاعت کی تو وہ چاہے تو مجھے ثواب دے گا۔ اور اگر میں نے اللہ کی نافرمانی کی تو مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے عذاب دے گا۔ تم اللہ سے ڈرو اور توبہ کرو۔ انہوں نے تب بھی توبہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے اگلے دن انہیں پھر لایا گیا اور قنبر (ان میں سے ایک شخص) آئے اور انہوں نے کہا: اللہ کی قسم، یہ تو وہی بات پھر

کہہ رہے ہیں۔ علیؓ نے کہا: انہیں اندر آنے دو، توانہوں نے ایسا ہی کہا۔ تیسرے دن علیؓ نے ان سے کہا: اگر تم لوگوں نے اب بھی وہی کچھ کہا تو میں تمہیں بری طرح سے قتل کردوں گا۔ انہوں نے توبہ سے پھر انکار کیا تو حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ مسجد اور محل کے دروازے کے درمیان ان کے لیے ایک گڑھ کھودا جائے۔ پھر انہیں نے حکم دیا کہ گڑھے میں لکڑیاں ڈالی جائیں اور ان کو آگ سے بھڑکایا جائے۔ پھر آپؓ نے ان سے کہا: میں تمہیں اس میں دھکیل دوں گا اگر تم توبہ نہیں کروگے۔ انہوں نے توبہ سے انکار کیا تو انہیں اُس میں پھینک دیا گیا"۔

جب ابن عباسؓ کو ان کے جلنے کی خبر پہنچی تو آپ نے ان کے جلانے پر اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ انہیں قتل کیا جانا چاہیے تھا۔ عکرمہؓ سے روایت ہے: "حضرت علیؓ کے سامنے بعض مرتد لائے گئے تو آپ نے ان کو جلوادیا۔ یہ بات حضرت ابن عباسؓ کو پہنچی تو آپؓ نے فرمایا: اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ان کو نہ جلواتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا تھا: "اللہ کے عذاب کے ساتھ عذاب نہ دو"۔ میں ان کو قتل کروادیتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: "جو اپنے دین کو بدل دے تو اس کو قتل کردو"۔ المہدی کے زمانہ میں ملحدین اور مرتدین کی تعداد بڑھ گئی تو وہ ان کو توبہ کے لیے بلواتے اور جو کوئی توبہ نہ کرتا، اس کو قتل کردیا جاتا۔ انہوں نے ان کی ایک بڑی جماعت کو قتل کیا۔

اس طرح مسلمانوں میں سے صحابہؓ، تابعین اور خلفاء مرتدین کو قتل کردیتے تھے۔ وہ کسی سستی کے بغیر اس معاملہ میں غیر متزلزل تھے۔ لیکن جب خلفاء کمزور ہوگئے اور اسلام کا فہم بھی کمزور ہوگیا، تو مرتدین کے قتل میں بھی تساہل ہونے لگا، حتیٰ کہ الحاد اور ارتداد پھیل گیا۔ یہ سلسلہ یہاں تک بڑھ گیا کہ بعض مرتدین نے اپنی جماعتیں بنالیں اور اُس دین کو اپنالیا جو کہ اسلام کے خلاف تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان میں وہن سرایت کرگیا باوجود اس کے کہ ایک طرف تو یہ ایک اہم مسئلہ تھا اور دوسری طرف یہ ایسا معاملہ تھا جس میں سفارش یا معافی کا سوال ہی نہ تھا۔

اس لیے یہ کوئی حیران کن نہیں تھا کہ مصطفی کمال جیسا شخص اسلام کے خلاف اعلان جنگ کردیتا، یعنی مرتد ہو کر اسلام کے خلاف ہو جاتا لیکن کوئی اس پر شرعی حکم نافذ کرنیوالا نہ ہوتا، کیونکہ اب ارتداد کے مسئلہ کو کوئی اہم مسئلہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور پھر یہی کچھ ہوا بھی۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس معاملہ کو اس کے اصلی مقام پر رکھا جائے اور ہر

مرتد کو قتل کرتے ہوئے اس معالمے کو ایک اہم مسئلہ سمجھا جائے چاہے اس کے لیے لاکھوں مرتدین کو ہی کیوں نہ قتل کرنا پڑے۔

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کسی بھی آدمی کو مرتد صرف اس بات پر ٹھہرادیں کیونکہ وہ مشکوک رائے رکھتا ہے۔ بلکہ کسی پر کافر یا مرتد کا حکم لگانے سے پہلے ہمیں قطعی طور پر یقین ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کہے جو اسے ننانوے فیصد تک مرتد بنادے لیکن اسے ایک فیصد مرتد نہ بنائے تو اس ایک فیصد کو فوقیت حاصل ہونی چاہیئے، اسے مسلمان سمجھنا چاہیئے اور اس پر مرتد کا حکم نہیں لگانا چاہیئے۔ یہ اس لیے کہ مسلمان حقیقتاً ایک مسلمان ہوتا ہے، اور اس پر کفر و ارتداد کا حکم نہیں لگانا چاہیے جب تک قطعی طور پر ثابت نہ ہو۔ اسی طرح ہمیں اُسے ارتداد کی سزا سے محفوظ رکھنے کے لیے نہ کوئی عذر تلاش کرنا چاہیئے اور نہ ہی بہانے، جبکہ وہ قطعی طور پر مرتد ہو، کیونکہ یہ اس اہم مسئلے میں زندگی و موت پر مبنی اقدام اُٹھانے سے انحراف ہوگا۔

لہٰذا، مسلمان اگر کسی ایسے کام کا مرتکب ہو جو اس کو مرتد بنادے جیسا کہ چرچ میں عیسائیوں کے ساتھ اُن کے طریقے کے مطابق عبادت کرنا یا کچھ ایسا کہنا جو اُس کو مرتد بنادے جیسے یہ کہنا کہ: "ابراہیمؑ کا واقعہ جو قرآن نے ذکر کیا ہے اس کو تاریخ نے روایت نہیں کیا، تو یہ جھوٹا قصہ ہے"۔ یا کوئی ایسا عقیدہ رکھے جو اس کو مرتد بنادے جیسا کہ یہ ماننا کہ اسلام آج کے دور کے لیے درست نہیں، یا دین کے ریاست سے جدا ہونے کا عقیدہ رکھے۔ یا وہ اسلام کی کسی قطعی حقیقت پر شک کرے جس سے مرتد ہو جائے، جیسا کہ قرآن کے اللہ کے کلام ہونے پر شک کرنا۔ ان جیسے اور ان سے ملتے جلتے معاملات میں وہ قطعی طور پر مرتد ہو جائے گا۔ تب ایسے معاملہ کو ایک اہم مسئلہ کے طور پر لینا ضروری ہے۔ لہٰذا اس کے لیے زندگی اور موت پر مبنی اقدام اٹھانا ضروری ہے جو کہ یا تو توبہ ہے یا موت ہے۔

اسی طرح اسلام نے اُمت کی وحدت اور ریاست کی وحدت کو اہم ترین مسائل میں سے قرار دیا ہے اور اس ضمن میں اُٹھائے جانے والے اقدام کو زندگی اور موت کا اقدام قرار دیا ہے۔ لہذا اسلام نے مسئلہ اور اقدام کا تعین کر دیا ہے۔

یہ بات دو واقعات میں واضح ہوتی ہے۔ ایک تو ایک سے زائد خلفاء کے ہونے کا معاملہ اور دوسرا باغیوں کا معاملہ۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا **«ومن بايع إماماً فأعطاه صفقة يده وثمرة قلبه فليطعه إن استطاع، فإن جاء آخر ينازعه فاضربوا عنق الآخر»** یعنی **"جس نے امام سے بیعت کی، اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنے دل کا پھل اسے دے دیا تو وہ جہاں تک ہو سکے اس کی اطاعت کرے۔ پس اگر کوئی اور اس سے جھگڑا کرنے آئے تو اس دوسرے کی گردن مار دو"** (مسلم) اور ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: **«إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما»** یعنی **"جب دو خلفاء پر بیعت کی جائے تو دوسرے والے کو قتل کر دو"** (مسلم)۔ لہٰذا آپ ﷺ نے ریاست کی وحدت کو اہم ترین معاملہ قرار دیا جب آپ ﷺ نے ایک سے زائد خلفاء ہونے کو منع فرمایا اور اس شخص کو قتل کرنے کا حکم فرمایا جو ایک سے زائد خلفاء کو قائم کرنے کی جسارت کرے۔ عرفجہؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: **«من أتاكم وأمركم جميع على رجل واحد يريد أن يشق عصاكم أو يفرق جماعتكم فاقتلوه»** یعنی **"جو تمہارے پاس آئے جبکہ تمہارے امور ایک آدمی کے ہاتھ میں ہوں (ایک پر اتفاق رائے ہو چکا ہو) اور وہ تمہارے بیچ دراڑ ڈالنا چاہے اور تمہاری وحدت کو بانٹنا چاہے تو اس کو قتل کر دو"** (مسلم)۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اُمت کی وحدت اور ریاست کی وحدت کو اہم مسئلہ بتایا جب آپ ﷺ نے جماعت میں دراڑ ڈالنے سے منع فرمایا اور اس شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا جو ایسا کرنے کی کوشش کرے، اگرچہ وہ بعض نہ آئے۔

جہاں تک باغیوں کا معاملہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما فإن بغت إحداهما على الأخرى فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله**﴾ یعنی **"اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن (دونوں) کے درمیان صلح کرواؤ پھر اگر اُن میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے، تو پھر تم بھی اُس سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہو حتّٰی کہ یہ (جماعت) بھی اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے (یعنی اللہ کے حکم کے تابع ہو جائے)"** (سورۃ الحجرات 49:9)۔

یہ اس لیے کیونکہ جس شخص کے ہاتھ میں اُمت کی امامت دے دی گئی یعنی اُس کو مسلمانوں کا خلیفہ چُن لیا گیا ہو اُس کے خلاف بغاوت حرام ہے، کیونکہ بغاوت کی وجہ سے اُمت کا اتحاد ختم ہوتا ہے، مسلمانوں کا خون بہتا ہے اور اُن کی دولت ضائع ہوتی ہے۔ السنہ میں اسامہ ابن شریکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«من خرج علی أمتي وهم جميع فاضربوا عنقه بالسيف كائناً من كان»** یعنی **"جو میری امت کے خلاف نکلے جبکہ وہ اکٹھے ہوں تو اس کی گردن تلوار سے مار دو چاہے جو کوئی بھی ہو"** (ابن ابی عاصم)۔ لہذا، امام کے خلاف نکلنے والے کو باغی تصور کیا جائے گا۔ اُنہیں توبہ کرنے کی دعوت دی جائے گی اور اُن کے شبہات کا ازالہ کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ اصرار کریں تو انہیں قتل کر دیا جانا چاہیے۔

ایک سے زائد ریاستوں کے وجود، ریاست کے خلاف بغاوت کرنے اور اُمت کی تقسیم کو حرام قرار دینے سے، اُمت کی وحدت اور ریاست کی وحدت ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے، کیونکہ شارع نے اس ضمن میں اٹھائے جانے والے اقدام کو زندگی اور موت کا اقدام قرار دیا ہے۔ لہذا جو کوئی بھی اس عمل کا مرتکب ہو گا، اس کو یا توبہ کرنی چاہیئے یا اسے قتل کر دیا جانا چاہیئے۔ مسلمان اس کو نافذ کیے ہوئے تھے اور اس کو نہایت اہم اور نازک ترین معاملات میں شمار کرتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ کسی مسلمان کے ساتھ رعایت نہیں برتتے تھے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہ سے کوئی رعایت نہ برتی تھی اور نہ ہی حضرت علی، بنواُمیہ اور عباسیوں نے خوارج کے ساتھ نرمی سے کام لیا تھا۔ اور اس سے متعلقہ قائم شدہ حقائق بیشمار ہیں۔ البتہ جب خلافت کمزور ہو گئی اور اسلام کی فہم میں بھی کمزوری آ گئی تو مسلمانوں نے اسلامی علاقوں کے خلافت سے ٹوٹ کر الگ ہو جانے پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ یوں مسلمانوں کے مابین ایک دراڑ آ گئی اور وہ متعدد ملکوں میں بٹ گئے، باوجود اس کے کہ کسی بھی ملک کا اس ریاست سے ٹوٹ کر الگ ہو جانا ہونا ایک اہم مسئلہ ہے جو یہ تقاضا کرتا ہے کہ یا تو باغیوں سے توبہ کروائی جائے یا پھر ان سے جنگ کی جائے گی، خواہ اُس میں کتنی ہی جانیں اور مال خرچ کیوں نہ ہو۔

اور حالت یہاں تک پہنچ گئے کہ مسلمان متعدد ریاستوں میں رہنے لگے اور خلافت بھی ان ریاستوں میں سے ایک ریاست تھی ۔ پھر حالت اس سے بھی ابتر ہو کر یہاں تک پہنچ گئے کہ بعض مسلمانوں نے ایک اسلامی لیگ(Islamic League) کے قیام کا مطالبہ جہاں خلافت اُن ریاستوں کے ساتھ کچھ معاہدات کر لے جو اُس سے ٹوٹ کر الگ ہو گئی تھیں۔یوں ریاست خلافت ان ملکوں کی علیحدگی کو اوران کے متعدد ریاستوں میں بٹ جانے کو تسلیم کر لے گی۔اس سے اُمت کی تقسیم کو تقویت ملے گی تاکہ وہ مختلف لوگوں اوراقوام میں بٹ جائیں، باوجوداس کے کہ یہ ایک اہم مسئلہ تھااور باوجوداس کے بھی کہ اس معاملے میں توبہ یاموت سے متعلق احادیث انتہائی واضح ہیں۔لہٰذا یہ تعجب کی بات نہ تھی جب مصطفی کمال نے ترکی سے باقی اسلامی علاقوں کی علیحدگی کااعلان کیااور نہ ہی یہ تعجب کی بات تھی کہ اس نے مسلمانوں کے علاقوں کو کفار کے حوالے کرنے کااعلان کیاکہ وہ اُن کی قسمت کافیصلہ کریں، کیونکہ یہ معاملہ ایک اہم مسئلے کی حیثیت کے اعتبار سے اپنے مقام سے گر گیا تھا۔یوں یہ آفت آگئی اور مسلمان مختلف ریاستوں میں رہنے اور متعدد لوگوں اوراقوام میں تقسیم ہو جانے کے حوالے سے لاتعلق ہو گئے۔یہ اسی لیے ہواکیونکہ اُمت کے اتحاد اور ریاست کی وحدت کے معاملے کواہم مسائل نہ سمجھا جانے لگااوراس ضمن میں اٹھائے جانے والے اقدامات زندگی اور موت کے اقدامات نہ رہے تھے۔اس لیے اس معاملہ کواپنے اصل مقام پر لوٹانااوراسے اہم ترین مسئلہ سمجھنا ناگزیر ہے جس سے خلافت کے وجود سے کسی بھی اسلامی سرزمین کی علیحدگی کوروکا جاسکے، چاہے اُس کے لیے کئی سالوں تک جنگ کرنی پڑےاور چاہے اس سے لاکھوں مسلمان قتل ہو جائیں۔

اسی طرح اسلام نے کفرِ بواح کے ظہور کواہم معاملات میں شمار کیاہےاوراس ضمن میں اٹھائے جانے والے اقدامات کوزندگی اور موت کے اقدامات گرداناہے۔اسلام نے معاملے کاتعین کیااوراُس سے متعلق اقدام کابھی۔مسلم نے عوف بن مالک سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«ستكون أمراء، فتعرفون وتنكرون، فمن عرف برئ، ومن أنكر سلم، ولكن من رضي وتابع، قيل: يا رسول الله أفلا ننابذهم بالسيف، فقال: لا، ما أقاموا فيكم الصلاة»**. وفي رواية: **«قلنا يا رسول الله أفلا ننابذهم عند ذلك؟ قال: لا، ما أقاموا فيكم الصلاة»** "عنقریب امراء

(حکام) ہوں گے، تم ان (میں بعض) کو معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جو معروف کرے وہ بری ہے۔ اور جو منکر کا انکار کر دے وہ سلامت ہے۔ لیکن جو (ان سے) راضی ہو اور تابعداری بھی کرے (وہ بری اور سلامت نہیں)۔ (صحابہ نے) کہا: کیوں نہ ہم ان سے قتال کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، جب تک کہ وہ تمھارے درمیان نماز قائم رکھیں"۔ اور بخاری نے عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: «**دعانا النبي ﷺ فبايعناه، فقال فيما أخذ علينا أن بايعنا على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا وأثرة علينا، وأن لا ننازع الأمر أهله إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم فيه من الله برهان**» یعنی "ہمیں نبی ﷺ نے بلایا تو ہم نے ان سے بیعت کی کہ ہم آپ ﷺ کو بیعت دیتے ہیں کہ ہم ہر خوشی و غمی میں آپ کو سنیں گے اور آپ کی اطاعت کریں گے، آسانی میں اور سختی میں یا کسی بھی مشکل میں، اور یہ کہ امیر کے ساتھ جھگڑا نہ کریں گے جب تک کہ کوئی کفرِ بواح کو دیکھ نہ لے، جس پر اس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہو"۔ اور طبرانی میں ہے: «**كفراً صراحاً**» "کھلا کفر" اور احمد کی روایت میں ہے: «**ما لم يأمرك بإثم بواحاً**" "جب تک وہ تمہیں کھلم کھلا گناہ کا حکم نہ دیں"۔ اور بخاری میں عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ اور ان سے عوف بن مالک الاشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: «**خيار أئمتكم الذين تحبونهم ويحبونكم وتصلون عليهم ويصلون عليكم، وشرار أئمتكم الذين تبغضونهم ويبغضونكم ويلعنونكم وتلعنونهم. قال: قلنا: يا رسول الله أفلا ننابذهم عند ذلك؟ قال: لا، ما أقاموا فيكم الصلاة**» "تمہارے لیے بہترین امام وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ وہ تمہارے لیے دعائیں کریں اور تم ان کے لیے دعائیں کرو۔ اور تمہارے بدترین امام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم ان پر لعنتیں بھیجو اور وہ تم پر لعنتیں بھیجیں۔" اس پر آپ ﷺ سے سوال کیا گیا: "کیا ہم ایسی صورت میں بزورِ شمشیر انہیں ہٹا نہ دیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس وقت تک نہیں جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز قائم رکھیں"۔ نماز کا قیام دین کے قیام سے ہے۔ یہ اسلام کے ساتھ حکومت کرنے سے بھی کنایہ ہے اور اس کے شعائر کے اظہار سے بھی۔ کفر بواح وہ کُفر ہے جو حاکم کے اقدامات سے نمایاں ہو یعنی کفر کے ذریعے سے حکومت۔

ان تمام احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ ہم حاکموں کے ساتھ مزاحمت کریں اگر وہ اسلامی احکام کو نافذ کرنے سے قاصر رہیں اور اسلام کے شعائر کے اظہار میں ناکام رہیں اور اگر وہ کفر کے احکامات کو نافذ کریں تو ہم ان سے قتال کریں۔اور ہم اگر کفرِ بواح دیکھیں تو حکمرانوں سے تنازعہ کریں۔اور ان سے تنازعہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بیشک ان سے قتال کرنا پڑے۔ الفتح میں ہے: **«وقد أجمع الفقهاء على وجوب طاعة السلطان المتغلب والجهاد معه، وأن طاعته خير من الخروج عليه لما في ذلك من حقن الدماء، وتسكين الدهماء. ولم يستثنوا من ذلك إلا إذا وقع من السلطان الكفر الصريح، فلا تجوز طاعته، بل تجب مجاهدته لمن قدر عليها كما في الحديث»** "فقہاء نے سلطان متغلب (جو مغلوب ہو گیا ہو) کی اطاعت اور اس کے ساتھ جہاد کے واجب ہونے پر اجماع کیا ہے۔اس کی اطاعت اس کے خلاف بغاوت سے بہتر ہے کیونکہ اس سے جانیں ضائع ہونے سے بچ جائیں گی اور رعایا پر سکون رہے گی۔ لیکن انہوں نے ایسی صورتحال کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جس میں سلطان سے کفر صریح ظاہر ہو۔ ایسی صورت میں اس کی اطاعت جائز نہیں ہو گی بلکہ اس کے خلاف ان لوگوں کو قتال کرنا چاہیے جو اس پر قادر ہوں، جیسا کہ حدیث میں ذکر ہے"۔ الشوکانی نے نیل الاوطار میں کہا: **«وقد استدل القائلون بوجوب الخروج على الظلمة ومنابذتهم بالسيف ومكافحتهم بالقتال بعمومات من الكتاب والسنة»** "جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ ظالموں کے خلاف نکلنا، تلوار کے ذریعے سے اُنہیں روکنا اور ان سے لڑ کر مقابلہ کرنا فرض ہے، انہوں نے قران اور سُنت میں موجود عمومی نصوص سے استدلال کیا ہے"۔ لہذا یہ معاملہ یعنی اسلام کے ذریعے حکومت کرنے کی فرضیت اور کفر کی حکومت کو روکنا ایک اہم مسٔلہ ہے کیونکہ شارع نے اس سلسلہ کے اقدامات کو موت اور زندگی کے اقدامات قرار دیا ہے کہ جو اسلام کے ساتھ حکومت نہ کرے اور کفر کے نظام کے ساتھ فیصلہ کرے، تو یا وہ توبہ کرے یا قتل کر دیا جائے۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے (یعنی وحی) وہ اس (وحی) کے علاوہ کسی ذریعے سے حکومت کیے جانے پر خاموش نہ رہیں کیونکہ یہ ایک اہم مسٔلہ ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کے دلوں میں تقویٰ کمزور

ہو گیا اور اسلام کے متعلق ان کی فہم میں بھی کمزوری آگئی تو ان پر آسان ہو گیا کہ اگر خلفاء اور حکام کسی ایک مسئلے میں کفر کے ساتھ فیصلہ کریں تو وہ اس پر خاموش رہیں۔ پھر جب یہ کمزوری مزید بڑھ گئی تو ان پر آسان ہو گیا کہ حکمرانوں کی جانب سے بہت سے معاملات میں کفر کے ذریعے حکومت کرنے پر خاموشی اختیار کیے رکھیں۔ اس خاموشی کا دیرینہ نتیجہ یہ نکلا کہ حکمرانوں کو یہ جسارت ہوگئی کہ وہ کھلم کھلا طور پر کفر کے احکامات کو نافذ کریں۔ مصر کے مسلمان اس وقت خاموش ہوگئے جب حاکم نے فرانسیسی قانون دیوانی (Civil Law) کو نافذ کیا اور شرعی احکامات کا خاتمہ کر دیا۔ پھر ریاست اسلامیہ میں مسلمانوں نے خاموشی اختیار کیے رکھی جب کفریہ احکامات کو 1909ء میں مسلمانوں کے دستور کے طور پر نافذ کر دیا گیا۔ اگرچہ ابتدا میں انہوں نے ان (احکامات) کے خلاف بغاوت کی لیکن بعد میں وہ خاموش ہوگئے۔ لہٰذا یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی جب مصطفیٰ کمال نے خلافت اور اسلام کے تمام احکامات کو ختم کر دیا اور کفر کے ذریعے حکومت کا اعلان کر دیا۔ یہ اس لیے ہوا کیونکہ مسلمان اب اسے ایک انتہائی اہم مسئلہ نہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا یہ آفت ٹوٹ پڑی کہ مسلمانوں پر یہ آسان ہو گیا کہ وہ کفر بواح ہوتا دیکھیں اور اُس کے خاتمہ کیلئے تلوار نہ اٹھائیں، بلکہ یہ بھی سہل ہو گیا کہ ان پر کفر کے ذریعے حکومت کی جائے اور وہ اس کی مزاحمت نہ کریں۔ پھر اس پر بھی مستزاد یہ کہ مسلمانوں کی اکثریت نے کفریہ احکام کو قبول کر لیا، اُن کے عادی ہوگئے اور اسلامی احکامات سے رضامندی کے ساتھ دستبردار ہوگئے۔ یہ صورتحال اس نوبت تک پہنچ گئی کہ کفر پر خاموش رہنے اور اس کے خلاف نہ لڑنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے کفر کے نظام کو قبول کر لیا اور اس کی جانب بلانے لگ گئے۔ اس سب کی وجہ یہ تھی کہ کفریہ نظام کے ذریعے حکمرانی کو ایک اہم مسئلہ کے طور پر نہ سمجھا جانے لگا اور اس کے لیے اٹھایا جانے والا اقدام زندگی اور موت کے لیے اٹھایا جانے والا اقدام نہ رہا۔ اس لیے اس معاملہ کو اس کے اصل مقام کی طرف لوٹانا اور اسے ایک اہم مسئلہ سمجھنا ناگزیر ہے۔ لہٰذا، کفریہ نظام کے ذریعے حکمرانی کو روکا جائے گا چاہے اس کا نتیجہ کئی سالوں پر محیط جنگ ہی کیوں نہ ہو اور چاہے اس کے نتیجے میں لاکھوں مسلمانوں قتل اور لاکھوں مومن شہید ہی کیوں نہ ہوں۔

لہذا، اہمیت رکھنے والے وہ تمام مسائل جن کو شارع نے بیان کیا اور متعین کیا ہے اور جن کے لیے شارع نے زندگی اور موت سے متعلق اقدام اُٹھانے کا حکم دیا ہے، ان سب کی سمجھ کمزور پڑ گئی تھی۔ ان مسائل کے اسلامی عقیدہ کے ساتھ تعلق جوڑنے میں کمزوری آگئی تھی اور انہیں ان کے اصل مقام سے اس حد تک نیچے گرادیا گیا تھا کہ ان کو اب نازک اور اہم ترین شرعی احکامات کے طور پر نہ دیکھا جانے لگا کہ جن کے لیے ہتھیار اُٹھائے جانے چاہیے تھے۔ لہٰذا انہیں اُس مرتبہ سے نیچے گرادیا گیا جس پر شارع نے انہیں رکھا تھا، یعنی انہیں اہم ترین مسئلے کے مقام سے گرادیا گیا۔ نتیجتاً شریعت نے ان کے لیے جس اقدام کا اٹھایا جانا مقرر کیا تھا، اس کو اب مزید ایسے نہ سمجھا گیا کہ کفر کی حکومت کو ہٹا یا جائے اور اسلام کی حکمرانی کو لوٹایا جائے۔ اس لیے خلافت کے خاتمے اور اسلامی نظام کے ہٹائے جانے کے معاملے کو ایک اہم مسئلہ نہ گردانا گیا، اور یہ کہ یہ معاملہ حقیقتاً ایک اہم مسئلہ تھا، لیکن اب غالب رائے کے مطابق ایسا نہ رہا۔ اس لیے مصطفی کمال اپنے اقدام میں آگے بڑھا، اس نے خلافت کا خاتمہ کیا اور اسلام کو سیاسی نقشے سے مٹا دیا اور کوئی اس کے خلاف اسلحہ لے کر اور اس سے قتال کرنے کے لیے نہ اٹھا۔ لہٰذا، کفار کی جانب سے خلافت کا خاتمہ اور اسلامی نظام کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا معاملہ لاکھوں مسلمانوں کی موجودگی میں انتہائی آسانی اور سادگی سے وقوع پذیر ہوا۔ اگر مسلمانوں نے اُس وقت اس حقیقت کا ادراک کیا ہوتا کہ یہ ایک اہم مسئلہ تھا جس پر مسلمانوں اور اسلام کی قسمت کا انحصار تھا اور اس سلسلے میں لازمی اقدام مسلح ہو کر مصطفی کمال کے خلاف قتال کیا جانا تھا، تو مسلمان اس جان لیوا ضرب کا شکار نہ ہوتے۔ لہٰذا، مسلمانوں کی اس بات کا ادراک کرنے میں ناکامی کہ یہ ایک اہم مسئلہ تھا جو اس سلسلے میں زندگی اور موت کے اقدام کو لازم قرار دیتا تھا، اس ہولناک حادثے کا سبب بنا جو ان پر قہر بن کر ٹوٹا۔

اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ کے مطابق حکومت کا قیام یعنی خلافت مسلمانوں کا اہم ترین مسئلہ ہے

آج مسلمان سخت ترین امتحانات اور بد ترین آزمائشوں سے گزر رہے ہیں۔ اس کا مؤثر حل اس بات میں پنہاں ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ ان کے مسائل اہم ہیں یا نہیں اور وہ ہر اہم ترین مسئلے میں زندگی اور موت کے اقدامات اٹھائیں۔ اور یہ خاص طور پر ضروری ہو جاتا ہے اگر زیرِ بحث معاملہ تمام اہم مسائل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو۔ جب تک یہ ادراک اس انداز سے حاصل نہ کیا گیا جو لوگوں کے دلوں پر اور ان کے ارد گرد کے ماحول پر حاوی ہو، تو اس وقت تک مسلمان پستی اور تنزلی کی ہی مستقل حالت میں مبتلا رہیں گے اور وہ اقوام کے درمیان کبھی اُبھر نہیں سکیں گے۔ اسی لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اہم مسائل کا ادراک کریں اور یہ ادراک ان کے دلوں، جانوں اور اُن کے ارد گرد کے عام ماحول میں جگہ پالے، تاکہ یہ ایسا ادراک بن جائے جو اُنہیں یہ باور کروائے کہ اہم مسائل زندگی و موت سے متعلق اقدامات اٹھائے جانے کے حوالے سے کیا لازم کرتے ہیں اور ایسا ایک غیر متزلزل عزم اور ایک بے دریغ جذبے کے ساتھ ہو۔ یہی اس مسئلے کا بنیادی نقطہ ہے اور درپیش حقیقت سے نمٹنے کیلئے مسلمانوں کی جانب سے کی جانے والی تمام کوششوں کی بنیاد ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ حقیقت کو ہر مسلمان محسوس کرتا ہے۔ یہ کسی تشریح یا وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ مسلمانوں کے علاقے کفریہ نظام کے تحت چل رہے ہیں، لہٰذا یہ قطعی طور پر دارالکفر ہیں۔ وہ چار سے زائد اقسام میں تقسیم ہیں، جن میں ممالک، امارت، سلطنتیں اور بادشاہتیں شامل ہیں۔ وہ اتنے کمزور ہیں کہ کفار کے سامنے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اسلامی دنیا میں ہر ملک کا یہ بنیادی مسئلہ ہے کہ وہ دارالاسلام بن جائے اور بعد میں باقی تمام اسلامی ممالک کے ساتھ متحد ہو جائے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے، بلکہ یہ ایسے ہے جیسے تمام اہم مسائل کو اکٹھا کر دیا گیا ہو۔ اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ اس کو زندگی اور موت کا معاملہ سمجھتے ہوئے اقدامات اٹھائے جائیں۔

البتہ یہ اہم مسٔلہ جو کہ ملکوں کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے اور انہیں بقیہ اسلامی علاقوں کے ساتھ متحد کرنے کا مسٔلہ ہے، یہ ایک مقصد ہے جسے حاصل کرنے کا مسلمان ہدف رکھتے ہیں۔ اور وہ طریقہ جسے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا جانا چاہیے وہ خلافت کو دوبارہ قائم کرنا ہے۔ اس لیے آج مسلمانوں کو جو مسٔلہ درپیش ہے وہ خلافت کو ایک حکومتی نظام کے طور پر قائم کرنا ہے جس کے ذریعہ علاقوں کو دارالاسلام میں تبدیل کیا جاسکے، اور نتیجتاً انہیں بقیہ اسلامی علاقوں کے ساتھ جوڑا جاسکے۔

تاہم یہ قطعی طور پر واضح ہونا چاہیئے کہ آج جس چیز کا مسلمانوں کو سامنا ہے وہ صرف خلیفہ کا تقرر نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے جیسا کہ ابن عمرؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«ومن مات وليس عليه إمام جماعة فإن ميتته ميتة جاهلية»** "اور جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت (کا طوق) نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا" (مسلم)، جس سے یہ ایک اہم مسٔلہ نہ رہے۔ بلکہ مسلمانوں کو آج جس مسٔلہ کا سامنا ہے وہ خلافت کا قیام ہے، جس کے لیے خلافت کے نظام کو ایک حکومتی نظام کے طور پر لانے کی ضرورت ہے۔ اور اس کام کی حقیقت خلیفہ کے تقرر سے کہیں زیادہ ہے، اگرچہ خلیفہ کا تقرر خلافت کے قیام کے لیے لازمی ہے۔

خلافت کا قیام قطعی طور پر ایک اہم مسٔلہ ہے، کیونکہ یہ ہمارے علاقوں کو دارالکفر سے دارالاسلام میں تبدیل کرنے کا طریقہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے قیام کا ایک ہدف کفریہ نظام کا خاتمہ بھی ہے، یعنی اُس کفر بواح کو ہٹانے کا ہدف جو اس وقت نافذ ہے، جو کہ ایک اہم مسٔلہ ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إلا أن تروا كفراً بواحاً»** یعنی **"مگر جب تم کفر بواح دیکھو"**۔ اور جب حدیث میں آیا: **«قيل: يا رسول الله أفلا ننابذهم بالسيف؟ فقال: لا، ما أقاموا فيكم الصلاة»** یعنی **"کہا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم ان کی مخالفت تلوار کے ساتھ نہ کریں؟ فرمایا نہیں، جب تک تمہارے درمیان نماز قائم رکھیں"**۔ لہذا، مسلمانوں کے مسٔلے تک پہنچنے کا طریقہ کار ایک اہم مسٔلہ ہے، کیونکہ یہ اہم مسٔلے سے متعلق طریقہ کار ہے اور کیونکہ سنت میں موجود شرعی

دلائل اس کے ایک اہم مسئلہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس سے متعلق زندگی اور موت کے اقدام اٹھائے جائیں۔البتہ، جب سے کفر مسلمانوں کے سینوں پر براجمان ہوا ہے اور جب سے ان کے معاملات کفار، منافقین اور مرتدین کے ہاتھوں میں گئے ہیں، تو وہ کفار کی اتھارٹی اور اس کے حکمرانوں اور ان کے ایجنٹوں کے اثر و رسوخ سے آزاد ہونے کی کوششیں کرنے سے پیچھے نہیں ہٹے ہیں۔وہ اس بات کا ادراک کرنے میں ناکام ہوگئے کہ جس مقصد کے لیے وہ جدوجہد کررہے تھے وہ اہم ترین تھا اور یہ کہ اس کے لیے زندگی اور موت کے سوا اور کوئی اقدام نہیں تھا۔لہذا، مسلمانوں میں اس ادراک کی کمی دراصل وہ وجہ تھی جس نے ان سے ایک گروہ یا ایک امت ہونے کی حیثیت سے غربت، تباہی اور موت کے ساتھ ساتھ تکلیف، قید اور تشدد برداشت کرنے کے لیے تیار رہنے کی صفت چھین لی، یعنی وہ کچھ جسے کسی صورت اہم مسائل کے لیے جدوجہد کرنے کے عمل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے ان کوششوں کا لازمی طور پر ناکام ہونا پہلے سے ہی طے شدہ تھا، اور وہ اس اہم معاملہ کے حصول میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے جس کے لیے وہ لڑ رہے تھے۔

مسلمانوں کو اس بات کا ادراک کرنے کے لیے بہت زیادہ تفکر اور سوچ بچار کی ضرورت نہ تھی کہ ان کا مسئلہ بہت اہم ہے۔پہلے لمحہ سے ہی یہ بات واضح تھی بالکل اس طرح جیسے یہ بات آج بھی ہر صاحب بصیرت پر واضح ہے کہ یہ عقلی طور پر ناممکن ہے کہ کفار اسلام کو سیاسی منظر نامے کی جانب لوٹنے دیں جب تک کہ اُن کے ہاتھوں میں اس کے لیے کوشش کرنے والوں کو روکنے کے لیے تھوڑا سا ظلم کرنے کی بھی سکت موجود ہے۔مرتدین اور منافقین کا کردار بھی اس جرم اور جبر کے اعتبار سے کچھ کم نہیں ہے۔طاقت کے لحاظ سے جو کچھ بھی ان کے پاس موجود ہے، وہ اس کو اس جنگ میں جھونک دیں گے تا کہ اُن مومنین کو روک سکیں جو اس لیے اُن سے اقتدار حاصل کرنے کا ہدف رکھتے ہیں کہ اللہ کے احکامات کو قائم کریں، اور حدود اللہ کے قیام کے ذریعے سے اللہ کے محرمات کا تحفظ کریں۔

لہذا، اس مسئلے میں مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی کسی بھی کوشش کا پھل ملنا اُس وقت تک ناممکن ہو گا جب تک کے وہ اس کو ایک اہم مسئلہ نہ سمجھیں، جس کا حصول زندگی و موت کے اقدام پر منحصر ہے۔چونکہ مسلمان

اس جنگ کی نوعیت کا اور اس جنگ سے متعلق اللہ کے صحیح حکم کا ادراک کرنے میں ناکام رہے، تو وہ اپنے آپ کو ایسے طریقہ سے آزاد کرانے کی کوشش میں لگ گئے جو اہم مسائل کے شایان وشان نہیں تھا۔ اس وجہ سے اس معاملہ میں ان کی کوششیں زندگی اور موت کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات سے کم درجہ کی تھیں۔ بلاشبہ، حقیقت یہ ہے کہ اہم مسائل کے معاملہ میں، جیسا کہ نظام کفر کے خاتمے اور اسلامی نظام کے قیام کا معاملہ ہے، خواہ اُن کو اہم سمجھا گیا تھا یا نہیں، کوئی ان کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا خواہ اس کی طاقت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور خواہ اس کی جانب سے صرف کی جانے والی کوششیں کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہوں، جب تک کہ ان معاملات کو اہم ترین مسئلہ تصور نہ کیا جائے اور جب تک ان کے معاملہ میں زندگی وموت کے اقدامات نہ اٹھائے جائیں۔ اس لئے مسلمانوں کو انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی واضح طور پر بتانا چاہیے کہ ان کے پاس کفر کے خلاف زندگی وموت کی بنیاد پر جدوجہد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، کیونکہ جو معاملہ اس وقت درپیش ہے اس کی نوعیت ایسے اقدامات کا تقاضا کرتی ہے اور اس لیے بھی کیونکہ شریعت نے کتاب وسنت میں ایسے ہی اقدامات کا حکم دیا ہے۔

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہمیں اپنے مسائل کا تعین کیسے کرنا چاہیے اور ہمیں حکم دیا کہ ہم ہر اہم ترین مسئلے میں زندگی وموت پر مبنی اقدامات اٹھائیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اسلام کا پیغام دے کر بھیجا اور جب آپ ﷺ نے فکری جدوجہد کے ذریعے اس دعوت کا آغاز کیا تو آپ ﷺ نے اس معاملہ کو اسلام کی فتح سے جوڑا اور اس ضمن میں آپ ﷺ نے زندگی اور موت کے اقدامات اٹھائے۔ روایت میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کے چچا ابو طالب نے بتایا کہ قریش ان سے کیا چاہتے ہیں، یعنی محمد ﷺ کو سردارِ مکہ پر تنقید کرنے سے روکا جائے۔ اور جب ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: "مجھ پر اور اپنے آپ پر رحم کھاؤ اور مجھ پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالو جس کو میں اٹھانہ سکوں"۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا **«يا عم والله لو وضعوا الشمس في يميني، والقمر في يساري، على أن أترك هذا الأمر حتى يظهره الله أو أهلك فيه ما تركته»** یعنی **"اے چچا! اللہ کی قسم اگر وہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر رکھ دیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر، کہ میں اس معاملہ کو چھوڑ دوں تو میں یہ نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ اس (دین) کو اللہ تعالیٰ غالب کر دے یا مجھے اس دوران موت**

آجائے"(سیرت ابن ہشام، دلائل النبوہ البیہقی)۔ جب آپ ﷺ نے اسلامی ریاست قائم کی اور تلوار سے جہاد شروع ہوا تو آپ ﷺ نے اس معاملہ کا تعین اسلام کی فتح کے طور پر کر کے اس کی اہمیت کا تعین کر دیا اور آپ ﷺ نے اس کے لیے زندگی اور موت کے اقدامات اٹھائے۔ روایت میں آتا ہے کہ جب آپ ﷺ عمرہ کے لیے تشریف لے جاتے ہوئے مکہ سے دو منزلوں کے فاصلہ پر عسفان کے مقام پر تھے تو آپ ﷺ کی ملاقات بنی کعب کے ایک آدمی سے ہوئی۔ آپ ﷺ نے اس سے قریش کے متعلق دریافت کیا کہ کیا اس کے پاس کوئی خبریں ہے۔ اس کا جواب یہ تھا: "قریش کو آپ ﷺ کے نکلنے کی اطلاع ہو گئی ہے اور وہ چیتوں کی کھالیں اوڑھ کر نکل چکے ہیں اور اللہ سے یہ عہد کر کے ذی طویٰ کے مقام پر پڑاؤ کیے ہوئے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کو اپنے اس عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اور خالد بن ولید اپنے دستے کے ساتھ کراہ الغمیم تک پہنچ گئے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«يا ويح قريش! لقد أهلكتهم الحرب. ماذا عليهم لو خلو بيني وبين سائر العرب، فإن هم أصابوني كان ذلك الذي أرادوا، وإن أظهرني الله عليهم دخلوا في الإسلام وافرين، وإن لم يفعلوا قاتلوا وبهم قوة. فما تظن قريش؟ فوا لله لا أزال أجاهد على الذي بعثني الله به حتى يظهره الله أو تنفرد هذه السالفة»** یعنی **"ہلاکت ہو قریش کیلئے! جنگ نے ان کو تباہ کر دیا ہے۔ ان کا کیا بگڑ جاتا اگر وہ مجھے اور باقی عربوں کو اپنے راستے پر جانے دیتے۔ اگر وہ مجھے قتل کر دیں تو یہی وہ چاہتے تھے اور اگر اللہ تعالیٰ مجھے ان پر غلبہ عطا کر دے تو وہ اسلام میں بکثرت داخل ہو جائیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ لڑیں گے جب تک ان میں قوت ہے۔ تو قریش کیا گمان کر رہے ہیں؟ تو اللہ کی قسم! جس مقصد کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا ہے میں اس کے لیے جدوجہد نہیں چھوڑوں گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس (دین) کو غلبہ عطا کر دے یا یہ گردن تن سے جدا ہو جائے"** (سیرت ابن ہشام)۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی حتیٰ کے حدیبیہ پہنچ گئے۔

ان دو معاملات میں، یعنی فکری جدوجہد کے ذریعے دعوت کو لے کر چلنا اور تلوار سے جہاد کے ذریعے لے کر چلنا، رسول اللہ ﷺ نے ان کو اسلام کی کامیابی کے ساتھ جوڑا اور انہیں ایک اہم مسئلہ قرار دیا۔ لہٰذا ان دونوں معاملات

میں لازمی اور ناگزیر اقدام اٹھایا جو کہ زندگی اور موت کا اقدام ہے۔اس لیے ایک جگہ فرمایا: «**حتى يظهره الله أو أهلك فيه ما تركته**» یعنی "**میں یہ نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ اس (دین) کو اللہ تعالیٰ غالب کردے یا مجھے اس دوران موت آجائے**"۔اور دوسری جگہ فرمایا: «**حتى يظهره الله أو تنفرد هذه السالفة**» یعنی "**حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس (دین) کو غلبہ عطا کردے یا یہ گردن تن سے جدا ہو جائے**"۔اگر رسول اللہ ﷺ نے اس کو اہم مسئلہ نہ بنایا ہوتا اور اس ضمن میں زندگی اور موت کا اقدام نہ اٹھایا ہوتا تو نہ تو فکری جدوجہد کے ذریعے دعوت پہنچانے سے اور نہ ہی تلوار کے جہاد کے ذریعے دعوت پہنچانے سے اسلام کو فتح حاصل ہوتی۔ مسلمانوں کی حقیقت بھی آج ایسی ہی ہے یعنی ان پر کفریہ نظام کا غلبہ اور کفار و منافقین کا ان پر تسلط۔ تو آج اگر وہ اپنے مسئلے کو ایک اہم مسئلہ نہ بنائیں اور اگر وہ اس ضمن میں زندگی اور موت کے اقدام نہ اٹھائیں، تو ان کی کوششیں کوئی رنگ نہیں لائیں گی اور وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔

اس لیے کفر کے اسلامی سرزمین پر اس غلبے کے دوران ہم ہر مسلمان کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کو ایک دارالاسلام میں تبدیل کرنے کے طریقے کے طور پر خلافت کے قیام کیلئے کام کرے اور اس کو باقی اسلامی علاقوں کے ساتھ جوڑے اور اسلام کے غلبہ کیلئے اس دعوت کو پوری دنیا کے پاس لے کر جائے اور اس دوران سچے ایمان، روشن ضمیری اور شعور کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا یہ قول دہرائے: «**والله لو وضعوا الشمس في يميني والقمر في يساري على أن أترك هذا الأمر حتى يظهره الله أو أهلك فيه ما تركته**» یعنی "**اللہ کی قسم! اگر یہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر رکھ دیں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ پر رکھ دیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں تو میں یہ نہ چھوڑوں گا، حتیٰ کہ یا اللہ تعالیٰ اس کو غالب کردے یا میں اس میں ہلاک ہو جاؤں**"، اور رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد: «**فوا لله لا أزال أجاهد على الذي بعثني الله به حتى يظهره الله أو تنفرد هذه السالفة**» "**تو اللہ کی قسم! جس مقصد کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا ہے میں اس کے لیے جدوجہد نہیں چھوڑوں گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس (دین) کو غلبہ عطا کردے یا یہ گردن تن سے جدا ہو جائے**"۔

رجب1382ھ

دسمبر1962ء